گھٹتے بڑھتے سائے

علی امام نقوی

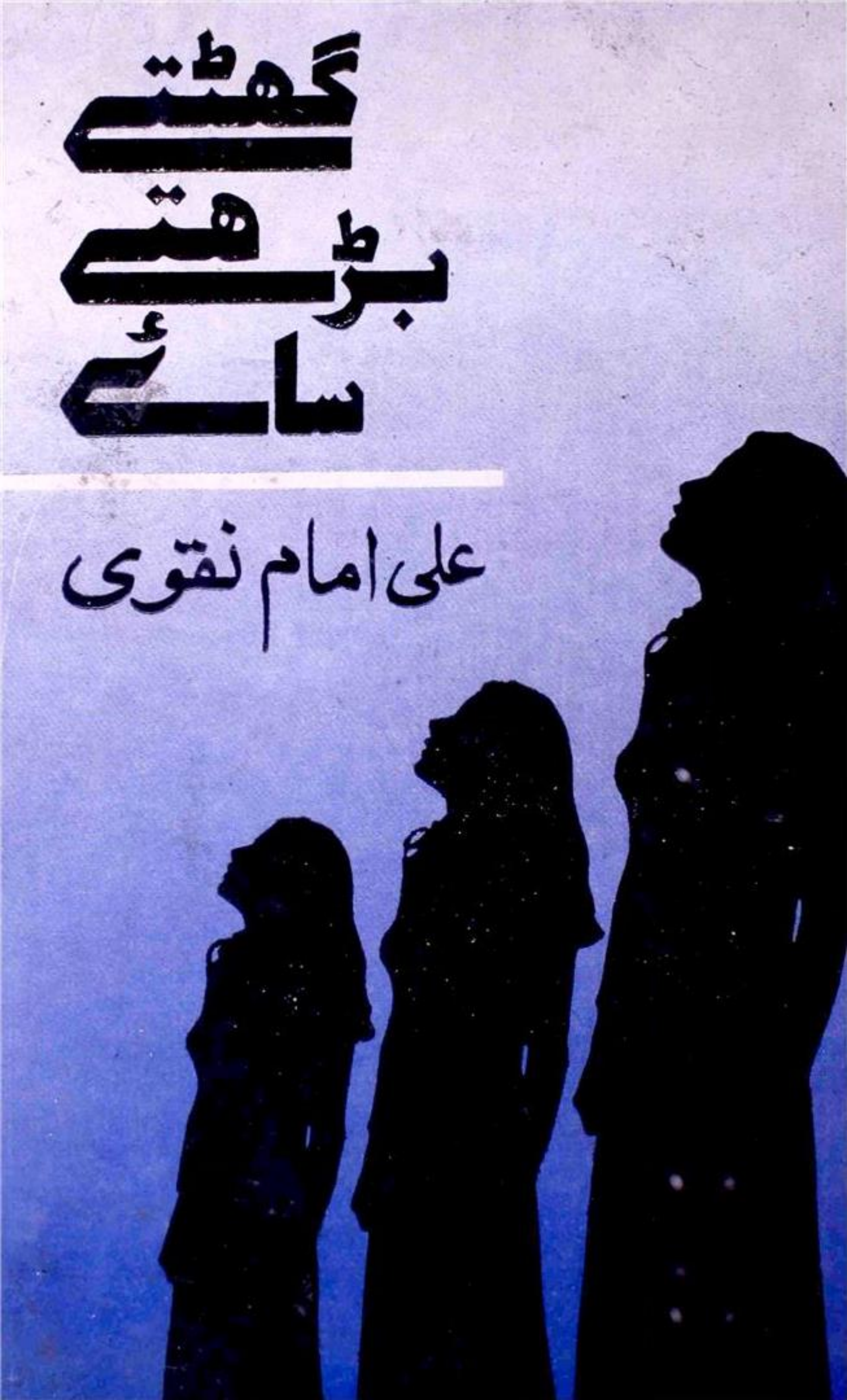

PDF By : Meer Zaheer Abass Rustmani

Cell NO : +92 307 2128068 - +92 308 3502081

گھٹتے بڑھتے سائے

افسانے

علی امام نقوی

تخلیق کار پبلیشرز

۱۷۷۹۔ کوچہ دکھنی رائے۔ دریا گنج۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

© شمیم نقوی (بھارت)
شرافت نقوی، ۴۰۱، ۱۵، اے ۱۰، بفرزون، نارتھ کراچی (پاکستان)

افسانے : گھٹتے بڑھتے سائے
مصنف : علی امام نقوی
پتہ : ۱۰۳/۵۴، نیا نگر کوآپریٹیو ہاؤسنگ سوسائٹی
نیا نگر، میرا روڈ (ایسٹ) ضلع تھانے ۴۰۱۱۰۷
بار اوّل : ۱۹۹۳ء
قیمت : پچاس روپے
ناشر : انیس امروہوی
تخلیق کار پبلیشرز، ۱۷۷۹، کوچہ دکھنی رائے، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲
سرورق : عذرا اعجاز (کراچی)
کتابت : شیخ عبدالرحمٰن
مطبع : رُوبی آفسیٹ پرنٹنگ پریس، دہلی ۱۱۰۰۰۶
ملنے کے پتے :
- موڈرن پبلیشنگ ہاؤس، ۹ گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲
- ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، گلی وکیل، کوچہ پنڈت، دہلی ۱۱۰۰۰۶
- نور پبلیشنگ ہاؤس، فراش خانہ، دہلی ۱۱۰۰۰۶
- اہلو والیہ بکڈپو، ۴۹/۹۹۸۸، نیو روہتک روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۵

اس کتاب کی اشاعت میں مہاراشٹر اردو اکیڈمی کا جزوی مالی تعاون شامل ہے۔

T.P. : 011
GHATTE BADHTE SAYE (Short Stories)
By ALI IMAM NAQVI
Takhliqkar publishers, New Delhi
1993 Rs.50/=

برادرِ محترم

سیّد قدرت نقوی صاحب

اور

اپنے بچّوں کے نام

چلے بھی جا جرسِ غنچہ کی صدا پہ نسیم
کہیں تو قافلۂ نوبہار ٹھہرے گا

—— مصحفی امروہوی

لکھو!

اور

اپنے علم کو اپنے دوستوں کے درمیان پھیلاؤ

اور

جب وقتِ مرگ آئے تو اپنے

بچّوں کو

بطور میراث سپرد کرو

کیوں کہ

جب ——— فتنہ و آشوب کا زمانہ آتا ہے

تو بجز کتاب

کوئی اور مونس و دمساز نہیں ہوتا۔

(امام جعفر صادقؑ)

ترتیب

ایک لمبی سڑک _____ ۷ تا ۱۴

خمیر _____ ۱۵ تا ۲۲

ایک ننگی کہانی _____ ۲۳ تا ۲۹

شائبہ _____ ۳۰ تا ۳۷

چھب _____ ۳۸ تا ۴۵

گھٹتے بڑھتے سایے _____ ۴۶ تا ۵۶

ننھی _____ ۵۷ تا ۷۰

محور _____ ۷۱ تا ۷۷
تال میل _____ ۷۸ تا ۸۳
سہارا _____ ۸۴ تا ۸۸
سلسلہ _____ ۸۹ تا ۹۷
ساتھی _____ ۹۸ تا ۱۰۳
ہونی _____ ۱۰۴ تا ۱۰۹
تیرہ اگست ۱۹۸۰ء _____ ۱۱۰ تا ۱۱۳
ایرینا _____ ۱۱۴ تا ۱۲۶

ایک لمبی سڑک

انہونی ان معنوں میں تو ہرگز نہ تھی کہ لوگ باگ حیرتوں سے دوچار ہوتے اور دانتوں میں انگلیاں دے لیتے یا پھر ہفتوں اس واقعہ پر گفتگو کرتے، انہونی وہ ان معنوں میں تھی کہ جھگڑا دارو کے اڈے میں ہونے کے بجائے باہر ہوا تھا اور لڑنے والے فریق دو شرابی مرد نہیں بلکہ شراب خانے کے باہر جرمن کے اوسط درجے کے تھکاوں میں تلے ہوئے چنے، مچھلیاں اور ابلے ہوئے انڈے فروخت کرنے والی ستائیس اٹھائیس برس کی معمولی شکل والی وسندھرا اور ایک شرابی کرشنا کے درمیان ہوا تھا۔ کرشنا شینخو کے اڈے سے نوٹاک کے دو گلاس پینے کے بعد جھومتا ہوا باہر نکلا تھا۔ طرح طرح کے منہ بناتے اور چٹخارے لیتے ہوئے اُس نے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی تھی، پھر چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے ہوئے وہ وسندھرا کے پاس جا بیٹھا تھا۔ حال احوال پوچھنے کے بعد اُس نے وسندھرا سے ایک اُبلا ہوا انڈا طلب کیا، وسندھرا نے کاغذ کے ٹکڑے پر انڈا رکھ کر اُس کی چار قاشیں بنائیں، ہر قاش پر نمک اور کالی مرچ کا سفوف چھڑکا اور کرشنا کی طرف بڑھاتے ہوئے اس سے پیسے وصول کئے۔ کرشنا نے ایک قاش منہ میں رکھی اور وسندھرا کے برابر، باردان پہ بیٹھی اس کی نو، دس برس کی بچی پر نگاہ پڑتے ہی اُس نے کاغذ پہ رکھے انڈے کی بقیہ پھانکیں بچی کی طرف بڑھائیں۔ بچی نے اجازت طلب انداز میں ماں کو دیکھا۔ وسندھرا نے کرشنا کو منع کرنا چاہا، مگر اس پر تو شراب اپنا اثر دکھا چکی تھی۔ کرشنا کا اصرار بڑھتا رہا، وسندھرا مسلسل انکار کرتی رہی۔ اسی انکار اور اصرار کے بیچ کی کسی گھڑی میں کرشنا نے بچی کے گول گال سہلانے شروع کر دیئے۔ وسندھرا کو اس کا احساس ہوا تو وہ بھوکی شیرنی کی طرح کرشنا پر جھپٹی۔ انڈے کی قاشیں دھول میں اٹ گئیں۔ کرشنا سنبھلتے ہوئے وسندھرا کو ماں بہن کی گالیاں بکنے لگا۔ اڈے سے شینخو اور اس کی رکھیل منّی بائی نکل آئے، شینخو نے کرشنا کو سنبھالا اور منّی بائی نے وسندھرا کو

'کیارے — دھندہ کھوٹا کرنے کو مانگتی

"وہ ..... حرامی سالا ..... میری سروپ کا گال مسلتا ہوتا۔ اُس کو سمجھا بائی ..... جا کے اپنی بہن کا مسل۔ نہیں تو ..... آئی چی شپت ..... میں اس کی

"اے ایڑی۔ جاتی ہوشیاری نہیں کرنے کا۔ بوڑھے کے ساتھ میں نڑنے کا نیئں۔ کیا۔ یہ لوگ کو مالوم کر منی؟" بائی نے وسندھرا کو سمجھانا چاہا تو شینخو نے اُسے اشارہ سے روکا۔ وہ کرشنا کو چھوڑ کر لوٹ رہا تھا۔

"جا تو اندر جا۔ میں دیکھتا اس کو ..... جا ــــ اس نے منی کو سمجھایا۔ وہ کولہے مٹکاتی شراب خانے میں داخل ہو گئی تب شینخو وسندھرا سے مخاطب ہوا۔

"اے بائی۔ میں پوچھتا۔ تو چھوکری کو ادھر بھٹا پچ کائے کو۔ ارے ... تیرے پاس گھر ہے۔ اس کو ادھر بھیج۔ اِدھر تو سالا۔ سب لوگ اپنی ماں ...... کو آتا۔ سمجھی کہ نہیں؟ مگر .... تو کیا سمجھے گی۔ میں سمجھتا، سب سمجھتا۔ ایسا کر۔ ابھی تو جا۔ کھولی پر ..... یہ ..... یہ لے دس روپیہ دیکھ چار پانچ بیدا نیچے لاہے۔ ادر تھوڑی مچھی۔ اپن دیکھے گا۔ تو جا۔ مگج ٹھنڈا رکھ۔

"بھائی ــــ وسندھرا نے رندھے ہوئے گلے سے اُسے مخاطب کیا۔ وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتی تھی لیکن شینخو نے اونچی آواز میں اُس سے کہا

"جا۔ بولا تو جانے کا۔ بولانا۔ اپن دیکھے گا۔ پن تو بھی ایک بات سمجھ۔ گٹر کے نجیک بیٹھے گی تو کھراب پانی انگا ور کسانائے ینار؟ (گٹر کے قریب بیٹھے گی تو خراب پانی جسم پر کیسے نہیں آئے گا) اَجُن تو گھر جا۔ اے۔ اَنّا

اُس نے ملازم کو آواز دی، پندرہ سترہ برس کا ایک سیاہ فام لڑکا آیا بھائی کہتا ہوا، اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ شینخو نے اُسے ہدایت دی کہ وہ وسندھرا کا سامان اپنے برتن میں منتقل کرے۔ اور دس روپے کا نوٹ وسندھرا کے حوالے کرنے کے بعد وہ شراب خانے میں داخل ہو گیا۔

کھولی میں داخل ہونے کے بعد وسندھرا نے اپنا ٹنڈیرا دھو دھا کر دیوار کے سہارے کھڑا کیا۔ سروپ نے اپنا بستہ زمین پر رکھ دیا تھا۔ اُسے دیوار میں نصب کھونٹی پہ ٹانگا اور دروازے کی چٹخنی لگانے کے بعد ساری اتار کر ایک طرف ڈالی۔ پل بھر کے لیے کچھ سوچا، جھک کر زمین پر سے ساری اٹھائی اور صابن کی بٹی لے کر موری میں داخل ہو گئی۔ ساری دھو کر انگنی پر ڈالتے ہوئے اُس نے سروپ کو دیکھا۔ وہ کھڑکی کی سلاخوں پر سر ٹیکے نیچے گلی کی چہل پہل دیکھنے میں محو تھی۔ وسندھرا کا دل ایک

دم سے بھر آیا ۔ اُس نے جھک کر سروپ کے گالوں کے چٹا چٹ کئی بوسے لئے اور دوبارہ موری کی طرف بڑھ گئی ۔ ٹین کے ڈرم میں سے بالٹی میں پانی انڈیلنے کے بعد اُس نے پیٹی کوٹ اتار کر اُسے پیروں سے ایک طرف سرکایا ۔ ہاتھوں کو موڑ کر بلاؤز کے ہک آزاد کئے ۔ برا ۔ الگ ڈالتے ہوئے ایک دم سے وہ پیچھے لوٹ گئی ۔

بے اختیار اُسے آئی اور بابا یاد آگئے ۔ کتنے سہنے تھے وہ دن ۔ ہر طرح کی فکروں سے آزاد تھی میں ۔ کبھی یہاں تو کبھی وہاں ۔ ریسکیو ہوٹل کے سرونٹ کوارٹرز میں تو کبھی رستم لاج کے سرونٹ کوارٹرز میں ۔ میں تھی اور سکھیاں تھیں ۔ روز صبح کوئلے سے دانت مانجھنے کے بعد میں رستم لاج پہنچ جایا کرتی تھی ۔ ماروتی کاکا کی بیٹی سمن کو لے کر میں بازار کی طرف نکل جاتی ۔ واپسی میں ۔ ہم اپنی اپنی فراک کے دامن میں جموئے جمع کرتے ہوئے لوٹتے ۔ گھر آکر وہ جموئے ایک برتن میں ڈھیر کرتے ۔ اچھی طرح دھونے کے بعد ہم سب بیٹھ کر جموئے کھاتے ۔ ہولی پہ رنگ کھیلتے ، دیوالی پر ماں کے سنگ رنگولی بناتے پٹاخے چھوڑتے ۔ بابا دارو پی کر گھر لوٹا کرتے تھے اور ماں کو ذرا ذرا سی بات پر پیٹا کرتے تھے ۔ ایک روز ان کی کسی بڑی غلطی پر سیٹھ نے انہیں نوکری سے نکال دیا تھا ۔ اپنے کسی دوست کے مشورے پر وہ اسی کے ساتھ بمبئی چلے آئے تھے ۔ اُسی نے اُنہیں مل میں نوکری اور کماٹی پورہ کی پانچویں گلی میں ایک کھولی دلوادی تھی ۔ کبھی کبھار دارو پینے والے بابا کو ان کے اُسی دوست نے پکا بیوڑا بنا دیا تھا ۔ بابا مل سے چھوٹنے کے بعد قریب ہی کسی اڈّے پر دارو پیتے ۔ گھر پہنچتے پہنچتے ان کا برا حال ہو جاتا ۔ ماں ان کے آگے کھانا پروستی ۔ کبھی کھاتے ، کبھی بکھیرتے اور منھ ڈال کر پڑ جاتے ۔ انہیں کھینچ کھانچ کر ماں بستر پہ لٹا دیا کرتی تھی ۔ اور اس کے بعد وہ بن سنور کر بابا کے دوست کی راہ تکا کرتی ۔ بابا کا وہ دوست روز ہی گھر آیا کرتا تھا ۔ اس کے ہاتھ میں دینی ہوا کرتی ۔ بھینی بھینی خوشبو بابا کے منھ اور نتھنوں سے پھوٹتی دارو کی بدبو پر حاوی ہو جاتی ۔ ایک دن کام پر سے چھوٹنے کے بعد بابا گھر کے بدلے شمشان پہنچ گئے ۔ بابا کا دوست اس حادثے کے بعد بھی آتا رہا ۔ مگر اب اس کے رویّے میں تبدیلی آگئی تھی ۔ پہلے وہ ماں کو صرف پیار کیا کرتا تھا ۔ اب وہ ماں کو گالیاں دینے لگا ۔ کبھی ہاتھ اٹھاتا تو ماں بھی بھڑ جاتی اور اس کے بعد خوب پٹتی ۔ بڑی عجیب تھی ماں ۔ کس بری طرح پٹا کرتی تھی وہ ۔ پر رات کو جب بھی آنکھ کھلتی اور میں موری میں سوسو کرنے جاتی تو دیکھتی وہ اُسی کے بغل میں پڑی ہے .....

صابن لگانے کے بعد پیٹی کوٹ کو مٹھیوں سے کوٹتے ہوئے فرش پر بہتے میل کو وسندھرا نے غور سے دیکھا تو تھوڑا سا پانی اس پر انڈیلنے کے بعد مٹھیاں بھینچ کر تیزی سے اُسے کوٹنے لگی .....

میں ۔ اُس سمئے شاید دس برس کی تھی ۔جب بابا کا دوست بھی پرلوک سدھار گیا۔ اب ماں فکرمند رہنے لگی تھی ۔ پڑوسن کے مشورے پر اُس نے بچی ہوئی رقم سے کچھ انڈے اور ٹماٹر خریدے ۔انڈوں کو ابالا ۔اور ایک تھالے میں رکھ کر قریب کے ایک شراب خانے پر پہنچ گئی ۔ اڈّے کے مالک نے پہلے تو غور سے ماں کو دیکھا ۔ پھر اُس کی بپتا سننے کے بعد اڈّے سے باہر اُسے دھندہ کرنے کی اجازت دے دی ۔ ماں روز شام ہونے سے پہلے انڈے ابال کر وہاں پہنچ جاتی ۔ شرابیوں کے مانگنے پر کاغذ کے ٹکڑوں پر انڈے کاٹنے کے بعد ان پر مصالحہ چھڑکتی اور میرے حوالے کرتے ہوئے کہتی ۔

" جا ۔ اندر ۔ وہ بیوڑے کو دے کر آ ۔ اور سُن .... آٹھ آنے لینے کو ۔ بھول مت ۔ سمجھی نا ۔

بھانت بھانت کے جانور تھے وہ ۔ روز ہی آیا کرتے ، ہنستے ، مسکراتے ۔ باس مارتی دارو کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھرتے ، پھر کوئی آواز دیتا

" اے بائی ایک بیدا جرا مصالحہ اچھا ڈالنے کا ۔ تھوڑا ٹماٹا بھی بھیج

ماں کے ہاتھ تیزی سے چلتے ۔ انڈا کاٹا جاتا ۔ مصالحہ چھڑکا جاتا اور پھر میری طرف بڑھاتے ہوئے ماں ہمیشہ کہتی

" جا ۔ وہ بیوڑے کو دے کر آ ۔ اور سُن آٹھ آنے لینے کا ۔ بھول مت ۔ سمجھی نا .....

کئی ڈونگے پانی ڈالنے کے بعد وسندھرا نے پیٹ پاٹ کر پیٹی کوٹ میں سے صابن کی چکناہٹ اور میل کو نکالا ۔ پھر کئی ڈونگے پانی مزید اس پر ڈالنے کے بعد پیٹی کوٹ کو اچھی طرح نچوڑ کر کھڑی ہوئی ، رسی پر پھیلے ہوئے پیٹی کوٹ کو ایک طرف سرکا کر اُس نے گیلا پیٹی کوٹ رسّی پر ڈالتے ہوئے سروپ کو کنکھیوں سے دیکھا اور جب وہ دوبارہ نہانے کے ارادے سے لکڑی کے پیڑے پر بیٹھنے لگی تو اپنی بڑی بڑی چھاتیوں پر نگاہ پڑتے ہی اُس نے برا سا منھ بنایا .....

کدھر بھولتی تھی میں ..... پر وہ ہمیشں یاد دلاتی ہوتی ۔ اندر لکڑی کے بنچوں پہ بیٹھے شرابی مجھے گھور گھور کر دیکھا کرتے ۔ ایک آدھ مجھے پیار سے اپنے پاس بلاتا تو میں اس کے پاس جا کے کھڑی ہو جاتی ۔

" انڈا کھائے گی

" نہیں ۔ ماں مارے گی

" نہیں مارے گی ۔ آ ادھر آ کر بیٹھ ۔ اِدھر باجو میں ۔ لے .... یہ لے .... منھ کھول

کتنا پیارا انداز تھا ۔ محبت سے بھرا ہوا ۔ مجھے لگتا میرے بابا مجھ سے مخاطب ہیں ۔ میں اپنا چھوٹا سا منھ کھول دیا کرتی تھی ۔ پاس بلا کر بٹھانے والے مجھے اٹھا کر اپنی گود میں بٹھا لیتے ۔ ایک گھونٹ دارو ، تھوڑا سا چکھنا اور ایک لمبی سی سسکاری کے بیچ وہ مجھے چومتے ۔ میرے گالوں میں چٹکیاں بھرتے ۔ اور

.... میری سپاٹ چھاتی سہلانے لگتے۔ کیسی گدگدی ہوتی تھی۔

"اے پورگی۔ ایک بیدا آن (اے لڑکی ایک بیضہ لا)

میں کسی گود سے اتر کر پھر ماں کے تھال میں اٹھنّی ڈال کر انڈا لیتی۔ کبھی کبھی ماں اور شرابی کے درمیان کا فاصلہ طئے کرتے ایک آدھ پھانک اٹھا کر منھ میں رکھ لیتی تو آرڈر دینے والا بوڑھا منھ بنا کر گندی سے بات کہدیتا۔ کوئی جھک کر میرا چھوٹا سا ماتھ چوم لیتا۔ اسی طرح دن گذر رہے تھے کہ ایک دن پانی نہاتے ہوئے میں نے اپنے میں ہونیوالی تبدیلی کو غور سے دیکھا اور سوچنے لگی کہ یہ کیا ہوگیا۔ میرا سینہ اب سپاٹ کیوں نہیں رہا؟ نہاتے ہوئے میں نے ماں کو پکارا۔ اور جب وہ میرے سامنے آکھڑی ہوئی تب میں نے اس تبدیلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ماں سے پوچھا تھا۔

"آئی۔ ہے کاے جھالا (ماں۔ یہ کیا ہوا)

خوب اچھی طرح یاد ہے مجھے۔ ماں نے اپنا نچلا ہونٹ دانتوں سے دباتے ہوئے مجھے غور سے دیکھا تھا۔ پھر ایک لمبا سانس کھینچ کر ساری ہوا اپنے منھ سے نکالنے کے بعد بڑے سہج انداز میں مجھ سے نظریں چراتے ہوئے اُس نے کہا تھا۔

"اَسے سَرو مُلی نا ہوتے وسندھرا (ایسا ہر لڑکی کو ہوتا وسندھرا)

ماں کا مطمئن کر دینے والا جواب سن کر میں نے بڑے غور سے ماں کے سراپے کا جائزہ لیا تھا اور پھر فوراً ہی میں مطمئن بھی ہوگئی تھی۔ لیکن اگلے دن سے ماں کچھ فکرمند سی رہنے لگی تھی۔ کچھ دنوں بعد جب میرا انگ پری ورتن کچھ زیادہ ہی نمایاں ہونے لگا اور اڈے میں شراب پینے والے مجھ سے زیادہ ہی کھیلنے لگے تب دارو کے اڈے کے مالک نے مجھے اندر آنے سے منع کر دیا۔ اور ماں کو بلانے کے بعد اسے بھی کچھ سمجھایا۔ ماں نے نفرت بھرے انداز میں بنچوں پہ بیٹھے شرابیوں کو دیکھا اور پلٹ کر میرے منھ پر ایک زوردار تھپڑ جڑ دیا۔ چٹاخ کی آواز آئی تھی۔ اور میرا گال بڑی دیر جھن جھناتا رہا تھا..........................

بڑی بے ہنگم مگر مانوس آواز تھی وہ۔ ڈھولک پر بید کی مسلسل رگڑ سے کانوں میں تکلیف سی ہونے لگی تھی۔ اس پر رک رک کر پٹاخ کی ایک اور آواز اُس نے سُنی۔ وسندھرا کی سوچ کا سلسلہ ایکدم سے ٹوٹا۔ اُسنے سنا۔ سروپ اُسے پکار رہی تھی۔

"آئی۔ آئی۔ مری آئی آلی (ماں، ماں۔ مری ماں آئی)

"تیلا نمسکار کر سروپ انی دھا پئیسے گھیا (اُسے نمستے کر سروپ اور دس پیسے دے)

پیڑے پر سے قدرے آگے کی طرف جھکتے ہوئے وسندھرا نے ہدایت کی۔ اور دیکھا کہ سروپ نے اپنے

ننھے ننھے ہاتھ جوڑ کر مری آئی کو نمسکار کیا اور دس پیسے کا سکہ بھی نیچے ڈال دیا۔ عین اسی لمحے سونٹا جسم پر پڑا اور پٹاخ کی آواز اُس نے سنی ....

سال بھر کے اندر ماں نے جانے کیسے اور کس طرح کیشو کو ڈھونڈا، اور ایک دن تین چار آدمیوں کو ساتھ لے کر کماٹی پورہ آٹھویں گلی ہنومان کے مندر میں پہنچی، مندر کے پجاری سے کچھ بات چیت ہوئی، بھگوان ہنومان کی مورتی کے سامنے مجھے اور کیشو کو کھڑا کر دیا گیا۔ پجاری اشلوک پڑھتے رہے اشلوک ختم ہوئے تو میں کیشو کو اور اُس نے مجھے مالا پہنائی، اس رات ماں چالی میں سوئی تھی۔ اور اندر کیشو میرے سنگ وہی سب کرتا رہا جو اڈے میں بوڑھے کرتے رہے تھے۔ میں حیران و پریشان تھی کہ آج یہ سب کچھ ماں خود کر وا رہی ہے۔ کیشو کبھی گال چومتا، کبھی ہونٹ اور پھر تو .... کافی دیر بعد جب وہ نڈھال ہو کر میرے برابر پڑ گیا تو بے اختیار مجھے ماں کا تھپڑ یاد آ گیا اس روز کافی دیر تک میرا گال جھن جھنایا تھا اور آج اسی تکلیف کو میں پھر محسوس کر رہی تھی۔

چھوٹے تولیے سے بدن پونچھتے ہوئے وسندھرا نے اپنے جسم پر نگاہ ڈالی تو فوراً ہی اس کی آنکھوں میں کئی چہرے گھوم گئے۔ طرح طرح کے منھ بناتے ہوئے شرابیوں کے چہرے اور دوسرے ہی پل ان چٹخارے لیتے ہوئے بوڑھوں کے درمیان ایک اور چہرہ نمودار ہوا۔ یہ چہرہ اس کے کیشو کا تھا۔ کیشو ــــ اس کا جیون ساتھی۔ پر کیسا تھا جیون ساتھی؟ بمبئی سینٹرل سے امبیت تک سفر کرنے والی بس کے اس مسافر کی طرح، جس نے اپنے لئے ٹکٹ تو امبیت کا خریدا تھا۔ لیکن جو پنویل پر اتر گیا۔ یہ سوچے بغیر کہ اس بن اس کے ہمسفر پہ کیا گذرے گی۔

بدن خشک کرنے کے بعد وسندھرا نے رسّی پر سے دھلا ہوا پیٹی کوٹ اور بلاوز اتار کر پہنا۔ سروپ کو بلا کر اُس نے بلاوز کے ہک لگوائے، پھر اسٹو جلانے کے بعد صبح کا بچا ہوا کھانا گرم کیا۔ تام چینی کی پلیٹوں میں سالن اور باسی روٹیاں نکال کر دونوں آمنے سامنے بیٹھ گئیں۔ سروپ چھوٹے چھوٹے نوالے توڑ کر کھانے میں مگن تھی۔ جبکہ وسندھرا تھم تھم کر لقمے توڑ رہی تھی۔ اپنی پلیٹ کا کھانا ختم کرنے کے بعد سروپ نے اٹھتے ہوئے انگڑائی لی۔ وسندھرا نے اُسے غور سے دیکھا۔ مٹکنے کے سے انداز میں وہ موری کی طرف بڑھی۔ ڈونگے سے پانی نکال کر اُس نے ہاتھ دھوئے کلّی کی۔ پھر ہاتھوں کو پیچھے کی طرف کر کے فراک سے ہاتھ پونچھے اور کھڑکی کے قریب بچھے ہوئے اپنے بستر پر جا کر لیٹ گئی۔ وسندھرا نے ایک مرتبہ پھر غور سے بیٹی کو دیکھا اور روٹی کی طرف

ہاتھ بڑھاتے ہوئے سوچنے لگی ۔

جو کچھ مجھ پہ بیت چکی ہے اس سے میں سروپ کو محفوظ رکھوں گی ۔ یہ سچ ہے کہ میرا گھر والا نہیں رہا ۔ گھر بالکل اکیلا ہے اور میرے سامنے ایک بہت لمبی سڑک ہے ۔ جس کے کناروں پر کوئی سائے دار درخت بھی نہیں ہے ۔ پھر بھی میں کوشش کروں گی کہ اس راستے پر میں اس طرح آگے بڑھتی رہوں کہ میرا سایہ سروپ کو دھوپ سے بچائے رکھے ۔ جو غلطی میری ماں نے کی تھی وہ میں ہرگز نہیں کروں گی ۔ آج جس سمسیا سے میں دوچار ہوں وہی مسئلہ ماں کا بھی تھا ۔ مجھے اپنی نگاہوں کے سامنے رکھنے کی خاطر ہی تو اُس نے مجھے اپنے سنگ رکھا تھا ۔ بس ۔ اس سے غلطی یہ ہوگئی کہ دارو کے اڈّے پر وہ اپنا سامان میرے ذریعہ پہنچاتی رہی ۔ اور ان شرابیوں نے .... سالے حرامی .... بیوڑے بازوں نے اپنی چکنی چپڑی باتوں سے پھسلا کر مجھے سمئے سے پہلے جوان کر دیا تھا ۔ پر .... میں نے تو اب تک وہ غلطی نہیں کی تھی ۔ سروپ کے ہاتھ میں نے تو کبھی اپنا سامان اڈّے میں نہیں بھیجا ۔ شنیچو بھائی بردبر بولتے ۔ گٹر کے نجیک بیٹھوں گی تو گندہ پانی آنگ پر آئے گا ہی ...... میں تو اپنی ماں کی مورکھتا کے کارن گٹر کے گندے پانی میں نہا چکی ہوں ۔ لیکن اپنی سروپ کے کومل شریر پر میں اس کے چھینٹے نہیں پڑنے دوں گی ۔ بس بھگوان ۔ اسے میرے جیون میں بڑا کردے ۔ کوئی بھلا مانس ملا اور میں نے اس کا لگن کیا ۔ بس بھلا ہو ۔ کیسا بھی چلے گا پن ۔ بیوڑا نہیں چلے گا ۔ عجیب چکّر ہے بابا ۔ کیشو اور وہ ۔ ماں کا یار ...... سب شرابی تھے ۔ مگر میرے کو سروپ کو نورا بیوڑا نہیں ہونے کا ۔

دوسرے روز صبح سروپ کو لے کر وہ میونسپل اسکول پہنچی تو اسکول کے بوڑھے چوکیدار سے اُس نے لجاجت بھرے انداز میں کہا کہ اسکول چھوٹنے کے بعد میری سروپ کو وہ اِدھر ہی بٹھائے رکھے ۔ شام کو آکر میں خود ہی اپنے ساتھ اسے لے جاؤں گی ۔ شنیچو کے اڈّے پر پہنچنے کے بعد اُس نے اطمینان سے پورے دن دھندہ کیا ۔ جو بھی شرابی انڈے ، تلے ہوئے چنے اور مچھلی کے قتلے مانگتے رہے وہ تیزی سے ان کے آگے رکھتی رہی ۔ چھ بجتے بجتے اس کا سارا سامان بک گیا ۔ تب اُس نے اپنے برتن اٹھا کر شنیچو دادا کے گلّے کے پاس کھڑے کر دیئے ۔ شنیچو نے اپنی سوالیہ نظریں اس کے چہرے پر مرکوز کرتے ہوئے آہستہ سے پوچھا

" تیری چھوکری کدھر ہے

" اُدھر چ ۔ اسکول میں

"کسالا

" وہ ۔ ادھرچ ٹھیک ہے .... اِدھر .... پھر کچھ لفڑا ہو سکتا ہے نا بھائی
شینخو نے غور سے اس کی بات سنی، کچھ سوچا۔ پھر مسکراتے ہوئے رک رک کر اُس سے بولا
" برو بر بولتی تو ..... اور اچھا کری .... اس کو ادھرچ رکھ ۔ سرکھشت رہے گی وہ اُدھر۔ اِدھر تو سالے سب لوگ .... ان کی ماں کو .... کیا بولوں میں وسندھرا بائی ۔ سالا بہوت کھراب ٹیم آگیلا ہے ۔

" میں ابھی آئی بھائی ۔ سروپ کو لے کر ۔ یہ میرا بھانڈا ادھر ہے
" جا ۔ بنداس جا۔ پھکر نہیں کرنے کا ۔ جا ۔ تچ
شینخو نے اُسے پچکارا۔ وہ مسکراتے ہوئے اسکول کی طرف بڑھ گئی ۔ اکّا دکّا بچّے اب بھی اسکول سے لوٹ رہے تھے بھاری بھرکم بستوں سے لدے ہوئے ۔ مضمحل اور نڈھال

تین چار منٹوں بعد ہی وہ اسکول کے صدر دروازے پر پہنچ چکی تھی ۔ دو چار بچے اپنے ماں باپ کی راہ تک رہے تھے ۔ سال خوردہ کرسی پر نیلی وردی میں ملبوس بوڑھا چوکیدار بیٹھا ہوا سورتی مسل رہا تھا ۔ وسندھرا نے اُس سے سروپ کے بارے میں پوچھا تو اس نے سورتی کو ٹھپکتے ہوئے کہا

" باہر آئی ہوتی وہ ۔ میں بولا جا ۔ کلاس میں بیٹھ ۔ تیری ماں آئے گی تو ادھر بھیجوں گا ۔
وسندھرا چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ہوئی سروپ کی کلاس کی طرف بڑھی ۔ اسکول میں سناٹا بول رہا تھا ۔ کسی کسی درجے میں ٹیچرز بچّوں کو ٹیوشن پڑھانے میں مصروف تھے ۔ کئی کلاسوں کے بعد جب وہ سروپ کی کلاس سے پہلے والے درجے کے قریب پہنچی تو اس کے پیر رُکے ۔ رگوں میں دوڑتے ہوئے خون کی رفتار ایک دم سے بڑھ گئی ۔ اُس نے دیکھا درجے میں بلیک بورڈ کے قریب کرسی پر ایک ٹیچر بیٹھا ہوا ہے اور اُس کی گود میں ایک بچی بیٹھی ہوئی ہے ۔ سامنے میز پر کوئی کتاب کھلی ہوئی ہے ۔ ٹیچر کا ایک ہاتھ کتاب کے پنّوں پر ہے اور دوسرا بچی کی بغل میں سے ہوتا ہوا .....
مٹھیاں بھینچ کر پوری قوّت کے ساتھ وسندھرا نے بیٹی کو پکارا ۔ ٹیچر نے ہڑبڑا کر بچی کو گود سے اتارا ۔ دوسری کلاسوں سے بھی ٹیچر اور بچے نکل آئے تھے ۔ ان میں سروپ بھی شامل تھی ۔ ماں کو دیکھنے کے بعد وہ تیر کی طرح ماں کی طرف بڑھی اس کا ہاتھ پکڑ کر جھٹکا ۔ لیکن وسندھرا وہاں کہاں تھی ۔ اُس کی مٹھیاں بار بار کھل رہی تھیں ۔ بھنچ رہی تھیں اور اُس کے کانوں سے شینخو دادا کی آواز ٹکرا رہی تھی ... " کیا بولوں میں وسندھرا بائی ۔ بہوت کھراب ٹیم آگیلا ہے ۔ ————— ○

خمیر

پولس ہیڈ کوارٹر میں آمد کے اندراج کے بعد کسٹم آفیسر آفتاب خان اسے اپنے گھر لے گئے تھے، وہاں نہا دھو کر، اور شام کی چائے وغیرہ سے فراغت پانے کے بعد اسے لیے ہوئے وہ ہوتو سنگھ روڈ پہنچے۔ کچھ ہی دیر بعد وہ دونوں جامن والی گلی میں کھڑے ہو کر ایک دروازے پر دستک دے رہے تھے۔ دروازہ کھلنے پر ایک نوجوان ان کے سامنے مجسم سوال بنا کھڑا ہوا تھا۔

"بھئی ..... کوئی بزرگ ہیں ..... گھر میں؟"

"جی ..... پر ..... پر بیمار ہیں وہ ..... دروازے تک نہیں آسکتے۔"

"ہوں۔"

آفتاب خان نے پل بھر کی خاموشی اختیار کی، سر جھکا کر کچھ سوچا، اور پھر سر اٹھانے کے بعد مسکرا کر نوجوان سے بولے:

"ایسا ہے ..... یہ صاحب انڈیا سے آئے ہیں۔ یہ مکان ہی ان کی منزل ہے اور میں یہاں کسٹم میں ہوں۔"

"لیکن ہمارا تو کوئی عزیز انڈیا میں نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے، ہمیں اپنے گھر کے کسی بزرگ سے ملواؤ؛"

کچھ دیر انتظار کی درخواست کرنے کے بعد وہ جوان دروازہ بھیڑ کر کوئی پانچ سات منٹ بعد دوبارہ ان کے لیے کواڑ کھولے کھڑا تھا۔ خاصا بڑا مکان تھا۔ نوجوان نے پورے گھر کو ایک پل میں آنکھوں میں سمو لینا چاہا۔

"اِدھر ..... اس طرف دالان میں۔"

"آیئے آیئے —" ایک ضعف بھری آواز انہوں نے سُنی — ... آواز کی طرف پلٹے — گاؤ تکیے کے سہارے نیم دراز ایک بوڑھے مرد کو انہوں نے دیکھا۔ علیک سلیک سے فارغ ہو کر بڑے میاں نے کھکارنے کے بعد پوچھا۔

"کیسے تشریف لائے ؟"

"یہ رحمت علی ہیں — دہلی سے آئے ہیں۔ میں یہاں لہور میں کسٹم پہ ہوں جی۔ ان کی باتوں نے مجھے مجبور کر دیا کہ ان کے ساتھ آپ تک پہنچوں — .... یہ ..... جیسا کہ نام سے ظاہر ہے ...... مسلمان ہیں۔ لیکن اپنی ماں کی راکھ اس گھر میں دفن کرنے کی خاطر اتنی دُور سے آئے ہیں ۔"

"ہُوں ۔"

بوڑھے نے آنکھیں بند کرتے ہوئے ہنکاری بھری ۔ ان کے پلنگ کے پیچھے سے سرگوشیاں ابھریں۔

"بڑی ٹھہری ٹھہری سی زندگی تھی میرے بچّو — پر — اب اک تلاطم برپا ہے ۔ دل میں بھی .... اور ..... دماغ میں بھی ۔"

"یہ مکان تو آپ نے کسٹوڈین سے الاٹ کروایا ہوگا ۔"

"ہاں ۔ کروایا تو تھا ۔"

"یاد ہے آپ کو ..... کس کے نام تھا یہ ؟"

"کوئی ..... اوں ......"

بوڑھے نے غالباً حافظے کے کواڑ تھپ تھپانے شروع کر دیے تھے

"جمنا داس ۔"

"ہاں ۔ ہاں ۔ یہی نام ..... جمنا داس ہی نام تھا۔

"میں ان کی بیوی کی راکھ لایا ہوں ..... اس گھر کی مٹی میں دفن کرنے کے لیے ۔"

بوڑھے نے نوجوان کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا ۔ کیوں کہ اس کی ساری توجہ حق کی طرف مبذول ہو گئی تھی ۔ اس کی بیوی ان کی طرف بڑھ رہی تھی ۔

"کہاں دفن کرو گے بیٹا ؟"

بوڑھی عورت نے قریب پہنچ کر نوجوان رحمت علی سے پوچھا ۔

"وہ تو ..... میں شام ڈھلے بتا سکوں گا۔ لیکن یہ طے ہے۔ راکھ ..... صحن میں دفن ہوگی۔"

"لیکن ہم نے سُنا ہے ہندو ـــــ مُردوں کی راکھ گنگا میں بہاتے ہیں۔ چق کے پیچھے سے آواز آئی۔

"جی ہاں۔"

"پھر آپ نے اتنا لمبا سفر کیوں کیا ؟" اسی آواز نے سوال کیا۔

"اس لیے کہ میری ماں کی وصیت ہی یہی تھی۔"

"کیا نام بتایا تھا ـــــ رحمت علی ـــــ ہے نا ــ" بڑے میاں نے پوچھا۔

"جی۔"

"تم ...... مسلمان ہو ...... اور ...... تمہاری والدہ ...... کیا تم معترف بہ اسلام ہوئے ....؟"

رحمت علی نے برا سا منہ بناتے ہوئے بڑے میاں کی طرف دیکھا۔ اور ایک مرتبہ پھر سارا واقعہ سُنانے کو تیار ہو گیا۔

"آپ کا نام رحمت علی ہے۔ اور آپ پاکستان پہلی مرتبہ آئے ہیں۔ اپنی ماں کی راکھ لے کر، کیوں ؟"

پاسپورٹ میں چسپاں ویزے کے مندرجات کو اپنی تحریر سے ملانے کے بعد کسٹم آفسر نے میز کے اس طرف کھڑے جوان کو دیکھا۔ بھارت سے آنے والے نوجوان کی باتوں نے اس کے دل میں تجسس پیدا کر دیا تھا ـــــ وہ کوئی قابلِ اعتراض سامان اپنے ساتھ نہیں لایا تھا۔

اُس کے دائیں کندھے پر ایک کیری بیگ ضرور لٹکا ہوا تھا، جس میں اس کے تین چار جوڑے، تولیہ، تہمد، صابن کی ٹکیہ اور ٹوتھ پیسٹ و برش موجود تھا، اور ہاتھوں میں پیتل کا تانبلوٹ

کسٹم افسر کی ہدایت پر تانبلوٹ اس نے میز کے کونے پر رکھ دیا تھا۔ تانبلوٹ کا منہ اک سرخ کپڑے سے ڈھکا ہوا تھا جسے کلابتو سے باندھ دیا گیا تھا اور اس پر ایک عدد ناریل بھی موجود تھا ـــــ اپنے تجسس کو اطمینان کے دائرے میں سمیٹنے کی غرض سے اس نے پھر نوجوان سے سوال کیا تھا۔

"کیا آپ کی ماں مسلمان تھیں ؟"

"ہاں وہ مسلمان تھیں۔"
"تو کیا بھارت میں مسلمان مُردے جلائے جانے لگے؟"
"جی نہیں!"
"بس یہی گتھی۔ میرے تجسّس کا باعث ہے۔"
کسٹم افسر نے نوجوان کے چہرے پر سے نظریں ہٹاکر رسٹ واچ پر نگاہ ڈالی۔ جھک کر میز کے نیچے سے بریف کیس اٹھایا۔ میز کی دراز میں سے دن بھر کی یافت بلاشمار بریف کیس میں منتقل کی۔ دوسرے ہم کار کو چارج دینے کے بعد اس نے نوجوان سے پوچھا۔
"آپ ہوتو سنگھ روڈ جائیں گے؟"
"جی ہاں!"
"چلیے۔ میرے ساتھ ......" پاسپورٹ اور دیگر کاغذات اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کسٹم آفیسر نے کہا ....
میری سوزوکی میں ...... ہوتو سنگھ روڈ کے قریب ہی میرا مکان ہے اور .... اور میں اس پورے واقعے کو جان لینا چاہتا ہوں۔

1000 - سوزوکی ــ سبک رفتاری سے کول تار کی سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ نوجوان کا بیگ پچھلی نشست پر، بریف کیس کے برابر ہی رکھا ہوا تھا اور وہ لیٹا ــ وہ اپنی گود میں لیے بیٹھا تھا۔
"ہاں جناب۔ اب آپ بتائیں۔ قصّہ کیا ہے؟ آپ کہتے ہیں میں مسلمان ہوں۔ والدین بھی مسلمان تھے۔ آپ زندگی میں پہلی مرتبہ لہو جارہے ہیں اور بقول آپ کے۔ اپنی ماں کی راکھ، آپ کو، ان کے آبائی مکان میں دفن کرنی ہے۔"
"جی ہاں!"
"میں پھر پوچھوں گا۔ آپ کے والد نے کسی ہندو خاتون سے عقدِ ثانی کیا تھا؟"
"جی نہیں۔"
"چھپائیں نہیں میاں۔ ہم لوگ تو ایسا کرتے ہی رہتے ہیں۔ اب میں آپ کو بتاؤں۔ میرے دادا نے تین شادیاں کی تھیں ...... ابّو نے بھی دادا کی روایت قائم رکھی۔ زبیدہ تھا

عیش تھے بندوں کے۔ کوئی پھڈا نہیں تھا۔ ایک چماری بھی ڈال رکھی تھی انہوں نے۔ اس سے ایک لڑکا بھی تھا۔ بہت کہا اس چماری نے ابّو سے کہ میاں کلمہ پڑھوا کر قدموں میں پڑا رہنے دو ..... پر ابّو نہ مانے ۴۷ء میں وہ اپنے بیٹے کو لے کر انڈیا چلی گئی۔ سنا ہے اس کا بیٹا آئی سی ایس کرنے کے بعد کسی منسٹری میں ہے ..... تو بھئی ایسا ہی کچھ آپ کے ابّو نے بھی ..... "

"نہیں ..... صاحب وہاں تو مؤلی اپنے پتّوں سے ہی بھاری تھی۔"

"پھر معاملہ کیا ہے؟"

"آپ تو پریشان ہو رہے ہیں۔"

"پریشانی کوئی نہیں۔ بس۔ تمہاری باتوں نے ..... معاف کرنا۔ میں تم پر آگیا... .... ہاں تو میں کہہ رہا تھا۔ تجسّس پیدا کر دیا ہے، تمہاری باتوں نے ـــ سب کچھ جان لینے کی خواہش میں ہی تمہیں اپنے ساتھ لہور لیے جا رہا ہوں ـ یہ دیکھو ..... یہ بستی ہے جو ہم نے ابھی ابھی پیچھے چھوڑی ہے نا ..... یہ قصور ہے۔"

"ہوں۔"

"اور اب ہم لہور کی طرف رواں ہیں۔ تم ..... شروع ہو جاؤ۔"

"ٹھیک ہے۔ تو سنیے۔ سنتالیس تک جو مشترکہ تہذیب تھی۔ اسی کی ایک قدرداں ہستی کی راکھ میں لیے جا رہا ہوں۔"

"بھئی تمہید کے بنا ہی شروع کر دو۔"

"ٹھیک ہے۔ یہ تو آپ جان ہی چکے ہیں کہ میرا نام رحمت علی ہے۔ کناٹ پیلس نئی دہلی میں الیکٹرو پوائنٹ نامی ایک دکان میں ٹیلی وژن درست کرتا ہوں۔ ایک دن دکان کے مالک نے مجھے ایک پتہ دیا اور کہا کہ اس پتے پر جا کے میں ٹی وی ریپئر کر آؤں۔ بس کے ذریعے جب میں اس پتے پر پہنچا تو دروازہ پر تالا پڑا ہوا تھا۔ بڑی کوفت ہوئی صاحب۔ دلّی کی سڑی ہوئی گرمی، بسوں کی بھیڑ، اور ان کا مکان تلاش کرتے کرتے گرمی سے میں بادلا ہو گیا تھا۔ تالے پر نگاہ پڑتے ہی میں نے ان صاحب کو دلّی کی گرمیوں کی طرح سڑی سڑی گالیاں بھی دی تھیں ـــ پھر یوں ہوا جناب ..... "

"سگریٹ پیتے ہو؟"

"جی پی لیا کرتا ہوں۔"

"لو"

کسٹم آفیسر نے گولڈ لیف کا پیکٹ اس کی طرف بڑھا دیا۔ نوجوان نے ایک سگریٹ نکال کر اس کا فلٹر توڑنے کے بعد باہر پھینکا تو کسٹم آفیسر نے استفہامیہ نظروں سے اُسے دیکھا اور سوچنے لگا۔ عجیب شخص ہے۔ اپنے ساتھ تجسس بھری کہانی لیے پھر رہا ہے۔ خود اس کی اپنی حرکات بھی متجسس ہیں۔ لوگ باگ فلٹر سگریٹ پینا پسند کرتے ہیں اور اس نے ..... اس سے برداشت نہ ہو سکا تو پوچھ بیٹھا۔

"تم نے فلٹر پیس توڑ کر پھینک دیا؟"

"جی ہاں!"

"کیوں؟"

"میرے خیال میں آدمی کو غلط کام کرنا ہی نہیں چاہیے۔ اور اگر کرنے پر مجبور ہو تو اس کی تمام تر مُضر صفتوں کو قبول کرنے میں آنا کانی نہ کرنا چاہیے۔"

"کہنا کیا چاہتے ہو؟"

"سیدھی سی بات ہے۔ زہر تو زہر ہے۔ اُسے فلٹر کر کے پیئو۔ یا فلٹر کے بغیر ..... ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ پٹیل نگر پہنچ کر میں بُری طرح جھلایا۔ پیاس کے مارے بُرا حال تھا۔ سوچا۔ چلو .... برابر والے فلیٹ کی گھنٹی بجائی جائے۔ ان ہی سے پانی بھی طلب کروں گا اور یہ اطلاع بھی دے دوں کہ میں آیا تھا اور مجھے واپس لوٹنا پڑا۔ تو صاحب۔ میں نے گھنٹی بجائی۔ کچھ دیر بعد ایک بڑی بی نے دروازہ کھولا۔ مجھے دیکھ کر وہ حیرت زدہ ہوئیں۔ میں نے اپنا تعارف کرایا اور پوری بات انہیں بتائی۔ ساری بات سُن لینے کے بعد پہلے تو انہوں نے کچھ سوچا، پھر دروازہ بند کر کے لوٹ گئیں۔ دو تین منٹوں بعد دروازہ کھولا۔ وہ محترمہ ہاتھوں میں پانی کی بوتل اور گلاس لیے کھڑی تھیں اور ان کے پیچھے ایک بوڑھا کھڑا ہوا تھا۔ دونوں ہی غور سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ بڑی بی نے گلاس میں پانی انڈیلا تو بڑے میاں بولے:

"دھوپ میں چل کے آیا ہے بچہ۔ اسے اندر بٹھاؤ۔ کولر کے سامنے، ذرا پسینہ خشک ہونے دو پھر پلانا۔ پانی وانی۔"

ان کے اصرار پر میں گھر میں داخل ہو گیا، کچھ دیر بعد میں کولر کے سامنے صوفے پر بیٹھا بڑے میاں کے سوالوں کا جواب دے رہا تھا۔

"تم بڑے صحیح سمئے پر آئے ہو۔ لو۔ یہ دال موٹھ منہ میں ڈالو اور پھر پانی پیئو۔"

تھوڑی سی دال موٹھ کھانے کے بعد، پانی پی کر جب میں اٹھنے لگا تو بڑی بی نے مجھ سے کہا :

"بڑا عجیب سا لگے گا۔ لیکن کہے بنا چارہ بھی نہیں۔ تم ..... آج کام سے چھٹنے کے بعد آسکو گے؟"

"کس لیے ؟"

"بات دراصل یہ ہے کہ آج کی تاریخ میں ہم ایک خاص پوجا کیا کرتے ہیں۔ پوجا سے پہلے جوت صرف بیٹا جلایا کرتا ہے اور ....."

بڑی بی نے اپنی بات ادھوری چھوڑ کر ساری کے آنچل سے آنکھیں پونچھنی شروع کر دی تھیں۔ میں نے دیکھا بڑے میاں بھی آب دیدہ ہو چلے تھے۔ میں سمجھ چکا تھا کہ ان کو خدا نے اولاد نرینہ سے محروم رکھا ہے۔ فوراً ہی میں نے طے کیا کہ اس جنجال سے نکل بھاگوں اور پھر کبھی پلٹ کر اس کوچے کا رُخ نہ کروں۔ لیکن صاحب ..... قسمت میں تو میری یہ سفر لکھا تھا ..... اس سے پہلے کہ میں انکار کرتا، بڑی بی نے کہا :

"اب تک یہ فرض ہمارا بیٹا ہی ادا کیا کرتا تھا وہ یہاں۔ لیدر کمپنی میں سیلز مین تھا۔ ۸۰ء میں وہ کمپنی کے ٹور پر مراد آباد گیا تھا وہاں ہندو مسلم بلوے میں مارا گیا ....

میں نے تاسف کا اظہار کیا تو بڑے میاں بولے :

"بٹوارے کے سمئے وہ ڈیڑھ اک سال کا تھا۔ ہم دنگوں سے بچ بچا کر یہاں پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ اب جب اس پہ جوانی آئی تو ساتھ ساتھ موت بھی چلی آئی اور آج ..... آج یہ پہلی پوجا ہے .. .. اس کے بغیر ..... ہم سوچ رہے تھے ..... آج پوجا کس طرح کریں گے۔ جوت کون جلائے گا۔"

"اور تم جوت جلانے پر آمادہ ہو گئے ؟"

"انسانی بنیادوں پر مجھے آمادہ ہو ہی جانا تھا۔

"سچ کہتے ہو۔"

"میں ..... اُس شام پوجا میں شریک ہوا۔ اس بوڑھی عورت نے پوجا کے بعد میری آرتی اتاری۔ میری درازیٔ عمر اور سلامتی کے لیے اپنے بھگوان سے گڑگڑا کر دعا مانگی۔ پرشاد سے میرا منہ میٹھا کیا۔ پھر میرے ہی ہاتھوں دونوں میاں بیوی نے پرشاد کھایا۔ میں ان کے جذبات کے احترام میں ان کی ہدایت پر عمل کرتا رہا۔ رات کا کھانا بھی میں نے وہیں کھایا۔ اس کے بعد انہوں نے رخصت کرتے ہوئے مجھ سے وعدہ لیا کہ میں دوسرے تیسرے اپنی صورت انہیں ضرور دکھا دیا کروں۔ دونوں کا شفقت آمیز رویہ دیکھتے ہوئے میں نے حامی بھر لی۔

وہاں جوں جوں میرا آنا جانا بڑھتا رہا۔ میں محسوس کرنے لگا کہ ان کے وجود میں پروردگار نے مجھے وہ نعمتیں لوٹا دی ہیں جن سے میں محروم ہو گیا تھا اور ..... اس احساس کے پیدا ہوتے ہی میں انہیں ماں جی۔ اور بابا کہنے لگا کہنے کیا صاحب۔ سمجھنے بھی لگا۔ ایک روز ماں جی نے مجھے اپنے پاس بٹھا کر مجھ سے وعدہ لیا کہ جب بھی میں مروں میری چتا کی راکھ لہور میں ان کے مکان کے صحن میں .....نیم کے پیڑ تلے دفن کرنا اب تیرا کرتو یہ ہوگا۔

سب ہی چپ تھے۔ اس کی نظروں کے سامنے بوڑھا منہ کھولے اسے دیکھ رہا تھا۔ بڑی بی سراپا حیرت بنی کھڑی تھیں۔ جانے کب، کس طرح اور کیوں چق کے پیچھے سے دونوں لڑکیاں آن کر باپ کے سرہانے کھڑی ہو گئی تھیں ـــ شاید ان کے دلوں میں تجسّس پیدا ہو گیا ہو۔ کافی دیر بعد جس جوان نے دروازہ کھولا تھا اس نے خاموشی کو توڑا۔

"لیجئے۔ شام ڈھلا چاہتی ہے۔ اور اب ..... آپ کو مرحومہ کی راکھ دفنانی ہے۔"

"ہوں"

اس نے پہلو بدل کر آسمان کی طرف دیکھا ..... پھر اس نوجوان سے بولا:

"بھائی۔ کوئی کھرپہ وغیرہ یا کدال وغیرہ مل سکتا ہے۔"

باپ کے سرہانے کھڑی لڑکیوں میں سے ایک تیزی سے زیر دیوار بنی کیاریوں کی طرف لپکی اور دوسرے ہی پل وہ اوسط درجے کا کھرپہ لیے کھڑی تھی

شام کچھ اور گہری ہو چلی تھی۔ اس کی نظریں بار بار آسمان کی طرف اٹھنے لگیں۔ ایک بار سب ہی نے اس کے چہرے پر مایوسی کے سایے بھی دیکھے ـــ اور۔ انہیں دیکھ کر نہ جانے کیوں خود ان سب کے دلوں میں بھی مایوسی پیدا ہونے لگی تھی کہ ان سب نے دیکھا یکایک رحمت علی کا چہرہ کھل اٹھا ہے۔ سب کی نگاہوں نے رحمت علی کی نظروں کا تعاقب کیا اور دیکھا صحن کے بیچوں بیچ کچھ پنچھی بار بار منڈلا رہے تھے۔

رحمت علی نے کھرپہ لے کر صحن کے وسط میں ٹھیک اسی جگہ گڑھا کھودنا شروع کر دیا جس کے اوپر پرندے دائرے کی شکل میں پرواز کر رہے تھے۔

کسٹم آفیسر آفتاب خاں، بوڑھے میاں بیوی، جوان لڑکا اور دونوں لڑکیاں بڑے انہماک سے گڑھے کو گہرا ہوتے دیکھ رہے تھے۔ رحمت علی کے قریب ہی تانبلوٹ میں اس کی ماں کی چتا کی راکھ موجود تھی اور رحمت علی کی پیشانی و ناک کی نوک سے پسینے کے قطرے اس گڑھے میں ٹپکتے جا رہے تھے۔ ○

ایک ننگی کہانی

بیوی اور بچے سہمے سہمے مجھے دیکھ رہے ہیں، خود میرا اپنا دل بھی بڑی زور سے دھڑک رہا ہے، لیکن میں ان پر اپنا خوف ظاہر نہیں کر سکتا۔ نو، نومبر ۸۹ء کسی عفریت کی طرح سب پر سوار ہے۔ ہم سب سہمے ہوئے ہیں اور وہ نعرے لگا رہے ہیں۔

"قسم رام کی کھاتے ہیں

"مندر وہیں بنائیں گے

کھالا پار سے کافی فاصلے پر شیوجی کے چوک پر گیروے لباسوں میں ملبوس ہزاروں ترشول دھاری محض چند لمحوں کے لیے خاموشی اختیار کرتے ہیں اور پھر لاؤڈ اسپیکر سے ایک آواز بلند ہوتی ہے

"بولو سیارام کی جے

"بولو ہنومان کی جے

"مسلم تیرے دو استھان

"پاکستان اور قبرستان

فلک شگاف نعرے ہوا کے دوش پر سوار ہو کر آس پاس، بستی کے مکینوں کے دماغوں پر خوف و ہراس مسلط کرتے آگے بڑھ رہے ہیں۔ بیوی پریشان ہے اور بچے دم سادھے بیٹھے ہوئے ہیں۔

"اندر سے تالا لگا دو — بیوی بڑی بیٹی سے کہتی ہے۔ میں بے چارگی سے بیوی کو دیکھتے ہوئے کہتا ہوں۔

"رہنے دو۔ ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ طوفان بھی گزر ہی جائے گا۔

بیٹی سوالیہ انداز میں ماں کو دیکھتے ہوئے چوکی پر بیٹھ جاتی ہے۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد ماں بچوں کو مخاطب کرتی ہے۔

" وضو کرلو تم سب، اور قرآن مجید کی تلاوت کرو۔ اللہ سے دعا کرو۔ سب جگہ امن امان رہے۔

دستی نل کی ہتھی چلنے لگتی ہے۔ بچے وضو کرنے میں لگ جاتے ہیں۔ اور میں سوچتا ہوں۔ پورا سال بیت گیا۔ دوستوں کو خط لکھنے کے علاوہ میں نے کچھ نہیں لکھا۔ جو کہانیاں ذہن میں تھیں وہ اس وشال دھرتی پر ہر سو پھیلی آگ میں جل گئیں۔ ذہن دن بدن الجھتا ہی رہا کہ ہم کہاں جارہے ہیں جو راستہ ہم نے اپنے لیے چنا ہے اس کا انت کہاں ہوگا؟ ذہن جب زیادہ الجھا تو میں نے کتابوں میں پناہ لی۔ انسانی قدروں پر منحصر وہ آفاقی تحریریں پڑھتا رہا جن کی معنویت پر میرا ایمان ہے۔ لیکن کتنی کھوکھلی ثابت ہوگئیں وہ قدریں۔ کیوں ہوا ایسا؟ مجھے اسی موضوع پر کہانی لکھنی چاہیئے۔

بچے وضو کرچکے ہیں، تینوں بچیوں اور بیوی نے اپنے اپنے جسم کا بالائی حصہ دوپٹوں میں مستور کرلیا ہے۔ میں نے میز کی دراز سے پیڈ نکال کر میز پر رکھ دیا کہ انسانی اقدار کی ٹوٹ پھوٹ کا مرثیہ لکھوں۔

" گرد سے کہو

" ہم ہندو ہیں

" لے کے رہیں گے

" رام استھان

" ہندو ہے تو ہند میں رہ

" ورنہ پاکستان جا

سیکولر ملک میں فرقہ پرست ذہنیت اور اس کی ہلاکت خیزی پر کیوں نہ لکھوں۔ ابھی سوچنا بھی شروع نہ کیا تھا کہ ایک نسوانی آواز کی صدائے بازگشت میرے کانوں سے ٹکراتی ہے۔

" ملک کی اقلیت کو اکثریت کے جذبات کا احترام کرنا ہی ہوگا۔ ان کے وچاروں کو مانیتا دینی ہوگی "

کتنی آسانی سے پریہ درشنی نے بیج بو دیا تھا۔ اور ہمارے دانشور دم سادھے بیٹھے تھے، آہ بے چارے دانشور۔

" میاں، تم تو اپنوں میں ہو۔ پھر یہ لوہے کا دروازہ کیوں لگوایا ہے؟

پڑوسی سلیم بیگ نے مجھ سے مسکراتے ہوئے پوچھا تھا۔ میں نے غور سے ان کے سالخوردہ کواڑوں پر لگی نیم پلیٹ کو دیکھا تھا۔

سلیم بیگ، بی۔ اے۔ آنرز

یہ سلیم بیگ کہاں رہتے ہیں؟ ہندوستان میں یا .....

"مسلمانوں سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ان کے لیے پی۔ اے۔ سی اور پولس کے جوان کافی ہیں"

"کیا مصیبت ہے؟

میں زیرلب بڑبڑاتا ہوں۔ ایک طرف انتہا پسند ہندو ہیں۔ رام راجیہ کا نعرہ لگانے والے، اکھنڈ بھارت کا خواب دیکھنے والے، دوسری طرف یہودی، عیسائی اور پی۔ اے۔ سی کے جوان۔

میرٹھ۔ جمشید پور، علی گڑھ، الہ آباد، کانپور، احمد آباد اور مظفر نگر

قاتل محافظ ہے اور محافظ ـــــ قاتل! آگے نگاہ ڈالیں تو افغانستان، ایران، عراق، لبنان اور فلسطین ـــــ عجیب کہانی ہے۔ کہاں سے شروع کی جائے؟

گھر پھونک کے ترا نہ ملا آج تک سکوں
شعلوں میں جل رہا ہے مسلمان آج بھی

یہ شعر کس نے کہا تھا؟ اس کی رمزیت پر ہمارے نقاد کچھ نہیں کہتے۔ کس طرح کہہ سکتے ہیں؟ ان کی نیندیں تو میرؔ و غالبؔ نے حرام کر رکھی ہیں۔ مجھے ان کے رت جگوں پر کہانی لکھنی چاہیئے۔ مگر نہیں۔ اس پر کہانی لکھی تو پڑھے گا کون؟ اور کیا عجب پھر کوئی نیاز پیدا ہو جائے اور میرے لئے میرا اپنا شہر کوفہ بن جائے۔ تو پھر .....

ایک طرف فرقہ وارانہ صورت حال، دوسری طرف گرانی کا یہ عالم کہ شکر اپنی مٹھاس کھو چکی ہے۔ مہنگائی میرا موضوع بن سکتا ہے۔ لیکن۔ اس پر "روپے، آنے پائی" سے اچھا افسانہ میں لکھ سکوں گا؟

"نہیں۔ یہ بھی نہیں

میں قدرے بلند آواز میں بڑبڑاتا ہوں۔ بیوی اور بچے تلاوت روک کر مجھے استفہامیہ انداز میں دیکھتے ہیں۔ کنکھیوں سے انہیں دیکھنے کے بعد میں پھر سوچنے لگتا ہوں کہ مجھے جلد از جلد موضوع منتخب کر لینا چاہیئے۔

"ہمیں اس دھرتی سے ہرے سانپ نکال باہر کرنے ہیں"

ہمارے بزرگ سید محمد عقیل علامتوں سے ناحق الرجی ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں حضور، شیو سینا پر کھ بال ٹھاکرے سے لے کر مسٹر کلین تک سب ہی علامتی، استعاراتی اور تمثیلی انداز میں باتیں کرنے لگے ہیں۔ یاد ہے آپ کو

ے کہا ہوا یہ جملہ

"جب بھی کوئی بڑا پیڑ گرتا ہے تو آس پاس کی زمین دہل ہی جاتی ہے۔"

واہ۔ اس بلیغ جملے کی بنیاد پر افسانہ لکھوں تو لوگ پھڑک اٹھیں گے۔ لیکن یہ کیا۔ یہ ہزاروں سکھ میرے سامنے کیوں آن کھڑے ہوئے ان کی ویران آنکھیں مجھ سے پوچھ رہی ہیں۔

"تو درخت کی کہانی لکھے گا یا اس زمین کی، جس پر وہ گرا؟

"نہیں یہ بھی نہیں

"پنجاب میں آتنک وادیوں نے ایک پریوار کے دس آدمیوں کو ختم کر دیا"

اُف ــ سوہنی کی دھرتی کی شہرت کلاسیکی ادب کی چار دیواری پھلانگ کر اپنے آتنک واد کے کارن دنیا بھر میں پھیل چکی ہے اور ہماری سرکار اٹھتے بیٹھتے بس اس کا کھنڈن کرتی رہی۔ کیوں نہ اس سوال پر کہانی لکھی جائے کہ وقت بدلتے ہی دہشت پسند کس طرح قومی ہیرو قرار دیئے جاتے ہیں؟ باقر مہدی تو پھڑک اٹھیں گے۔ بے ساختہ پکار اٹھیں گے "کمال کر دیا یار" پولیٹیکل کہانیاں انہیں پسند بھی آتی ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ میں اس موضوع سے انصاف کر سکوں گا۔

کیوں۔ کیا ہوا؟

پنجاب کو میں جانتا ہی کتنا ہوں؟ صافے۔ کیس اور کرپان کا نام تو پنجاب نہیں۔ اس موضوع پر تو نروِن کمار ورما کو لکھنا چاہیئے۔ وہ امرتسر میں اپنی آنکھوں سے انسانی لہو کو بہتے دیکھ رہے ہیں۔

بتائیے درپاجی ــ کون ظالم ہے اور کون مظلوم؟ اور خدارا یہ بھی بتاتے چلیئے کہ گذشتہ چار پانچ برسوں میں پنجاب کے آتنک واد پر ہندی میں جو ہزاروں کہانیاں چھپی ہیں کیا اس کا عشر عشیر بھی پچھلے چالیس برسوں میں ہونے والے ہندو مسلم فساد کے ذیل میں پیش کیا گیا؟ یہ سوال۔ میں اپنے بزرگ دوستوں۔ کنور سین اور جوگندر پال سے بھی کر سکتا ہوں۔ لیکن وہ تو خود ہی آتنک وادیوں کے کارن پیڑا میں گرفتار ہیں۔ ہاں سریندر پرکاش اور آتما رام سے بھی یہ سوال کیا جا سکتا ہے۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ سریندر پرکاش، وجے تندولکر کی داڑھی سے الرجی ہیں اور آتما رام خالص بھارتی مسائل کی کھچڑی کو مارکسی روغن سے بگھارنے کے لیے بدنام ہے۔

ادھر میرا دوست آصف خان کہتا ہے کہ اردو کے افسانہ نگار اپنے افسانوں میں عصری تاریخ لکھنے سے ڈرتے ہیں۔ میں اُسے کیسے سمجھاؤں کہ پیارے آصف! سچائی یہ ہے کہ اردو کے رسائل و جرائد کی اپنی حدیں ہیں اور ان سے پرے زنداں ہے۔ اور بھائی میرے اس دور میں ہمیں کہیں ابوذر،

مثیم اور مقداد نظر نہیں آتے ۔ آ بھی نہیں سکتے کیوں کہ بنانے والے نے اب ان ماؤں کا خمیر اٹھانا چھوڑ دیا جن کی کوکھ سے ایسی ہستیاں جنم لیا کرتی تھیں ۔

تو پھر میں کیا لکھوں ؟

میں ـــ ایک ہندوستانی افسانہ نگار ۔ جو ہندوستان کو ـــ ہندو ـــ استھان بنتے دیکھ رہا ہوں ۔ کس موضوع پر قلم اٹھاؤں ۔ ہماری اپنی رنگ برنگی تہذیب تو خون میں لت پت ہے ۔ سماجی اور سیاسی مسائل اسقدر پیچیدہ ہو چکے ہیں کہ انھیں سلجھانے کی کوشش کا نام موت ہے ۔ موت ۔ قتل ۔ یہ ٹھیک رہے گا ۔ مجھے قتل پر کہانی لکھنی چاہیئے ۔ مگر سوال یہ ہے کہ کون سے قتل کی کہانی لکھی جائے ۔ سڑکوں پر ہونے والے قتل کی جنہیں مرڈر کہا جاتا ہے یا اُس قتل کی جسے سیاست داں حکمت عملی قرار دیتے ہیں ۔

عجیب مصیبت ہے یارو ! آؤ ۔ میری مدد کرو ۔ کیا کہا ۔ متھ میں اتر جاؤں ۔ نہیں گڑ بڑ ہو جائے گی ۔ اس دلدل میں تو انتظار حسین پھنسے ہوئے ہیں ۔ پھر سوال یہ بھی تو پیدا ہوتا ہے کہ اس کھڑاگ کی ضرورت کیا ہے ۔ صاف سیدھی ، بیانیہ کہانی کیوں نہ لکھی جائے ۔ جس میں زندگی ہو۔ زندگی کا ماجرا ہو ۔

ٹک ٹک ٹک

یہ کیا ہے ؟ ہم نے تو اپنی حسیں تک رہن رکھ دی ہیں ۔ پھر یہ آواز ـــ ؟ آنکھوں پر اندھوٹا کس لیا ہے ۔ اور یہ ٹک ٹک اوہ ـــ کہیں ہمارے دل سٹی زن کوارٹس تو نہیں بن گئے ؟

- رام کا مندر بن کے رہے گا
- رام للہ ہم آئیں گے
- مندر وہیں بنائیں گے
- مسلمان بابری مسجد کہیں اور لے جائیں
- " " " " " "
- " " " " " "
- " " " " " "

" بابری مسجد کے وشئے پر تینوں دیشوں کا بیان ہمارے داخلی معاملات میں کھلی ہوئی مداخلت ہے "

واہ ـــ مسٹر کلین ۔ لگتا ہے بوفورس کی توپ داغ دی ہے ۔ دل خوش ہو گیا میاں ۔ مگر ذرا یہ

تو بتایئے شریمان کمبیوڑجی کہ سری لنکا اور مالدیپ ہندوستان کے کون سے صوبے ہیں؟

ٹھیک ہے اسی موضوع پر کہانی لکھی جانی چاہیئے کہ داخل اور خارج میں خطِ امتیاز کیا ہے؟

دروازہ تھپ تھپانے کی آواز پر ہم سب چونک پڑتے ہیں۔ بچوں کے زرد چہرے کچھ اور زرد ہو چلے ہیں اور بیوی ایک بہت بڑا سوالیہ نشان بن کر میرے سامنے کھڑی ہوگئی ہے۔ دور کہیں پھر نعرے بلند ہو رہے ہیں۔

"قسم رام کی کھاتے ہیں

" مندر وہیں بنائیں گے

" مسلم تیرے دو استھان

" پاکستان اور قبرستان

" رام للہ ہم آئیں گے

" مندر وہیں بنائیں گے

میں دروازہ کی طرف بڑھنا چاہتا ہوں تو بیوی راستہ روک کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ میں نے ایک نقلی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائی اس کا شانہ تھپکا۔ اور آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔

"سلام علیکم

میں سلام کا جواب دیتے ہوئے سوالیہ انداز میں محلے کے لڑکوں کی طرف دیکھتا ہوں۔

"ایسا ہے۔ دنگے کا ڈر ہے۔ ہم نے ہر گھر سے ایک لونڈا چنا ہے۔ آپ اپنے بالے کو بھیج دیں۔ باری باری پہرہ دیں گے ہم، میں نے غور سے ان بچوں کو دیکھا۔ ان میں بیشتر سترہ سے اٹھارہ کے درمیان تھے۔ سب کے چہرے جوش سے تمتما رہے تھے لیکن ان کی آنکھوں میں برا جا خوف مجھے صاف دکھائی دے رہا تھا۔

"پہرہ دینا۔ پولس کا کام ہے بچو! میں نے انہیں سمجھایا۔" تمہاری بھیڑ کا اُن پر غلط اثر پڑے گا۔ معاملہ بگڑ بھی سکتا ہے۔

وہ سب پہلو بدل کر رہ گئے۔ پھر ان میں سے ایک بولا

"آپ آفاق کو ہمارے ساتھ بھیج دیں

"..... میری مانو۔ اپنے گھروں میں جا کر اپنی اپنی ماں بہنوں کو سنبھالو۔ ڈر کے مارے ان کے برا حال ہوگا۔ اور یقین کرو۔ شہر میں کچھ نہیں ہوگا۔

"تو آپ آفاق کو نہیں بھیج رہے۔

"میں چاہتا ہوں تم .....

"ختم کرو یار۔ ہم ہی باولے ہوئے ہیں۔ سوری یہ نو، نومبر گذر جائے۔ پھر ہم ان میر صاحب کو بھی دیکھ لیں گے۔ اُن سے پہلے ہمیں انہیں ٹھیک کرنا ہوگا۔

فیصلہ ہوگیا، ایک ایک بچہ مجھے قہر آلود نظروں سے گھورتا ہوا لوٹ گیا۔ دروازوں کی درزوں جھانکتی ہوئی آنکھیں ایک ایک کر کے اوٹ میں ہوتی گئیں، میں نے دروازہ بند کیا اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے ہوئے کمرے میں داخل ہوا۔ بیوی اور بچے اب بھی سہمے ہوئے ہیں۔ تکیوں پر قرآن شریف کھلے ہوئے ہیں۔ اور میری نگاہ جس پل ہیڈ کی طرف بڑھ رہی تھی ٹھیک اسی وقت دُور کہیں نعرہ بلند ہوا تھا

"مسلم تیرے دو استھان .....

شائبہ

"عبداللہ پور، عبداللہ پور

آصف آباد جانے والی پرائیوٹ بس کا کنڈکٹر پچھلے پائیدان پہ کھڑا چیخ چیخ کر مسافروں کو بلا رہا تھا۔ ان دونوں کو عبداللہ پور ہی جانا تھا، کنڈکٹر کی آواز پر اُس نے شبانہ کا بایاں بازو پکڑا، اور جوں ہی تیزی سے اُسے ساتھ لے کر بس کی طرف بڑھنے کی کوشش کی تو اُسے لگا، شبانہ گوشت پوست کا وجود نہیں۔ پتھر کی مورت ہے۔ جس کے پیر زمین میں بہت اندر تک دھنسے ہوئے ہیں۔ اِس احساس کے پیدا ہوتے ہی اُس نے اپنی کنپٹی کی نسوں میں خون کے دوران کی تیزی کو محسوس کیا، سر کو دائیں جانب موڑنے کے بعد ناراضگی کے اظہار کی خاطر اُس نے شبانہ کو گھورا۔

"رکشے سے چلیں گے

دھیمے لہجے میں شبانہ نے اپنے میاں کو مخاطب کیا تو اُس کی خفگی اور بڑھ گئی، اُسی عالم میں اُس نے سوچا، امّی، خالہ جان اور بابا غلط تو نہیں کہتے۔ واقعی شبانہ تھوڑی سی .....

سوچ کا سلسلہ آگے نہ بڑھ سکا کہ اس تھوڑی سی سے آگے سوچنے کا ارادہ اُس نے کئی مرتبہ کیا تھا، لیکن جب بھی اُس کا ذہن اس سمت بڑھا، شبانہ کی آنکھیں زبان بن گئیں، اُس کا عمل آڑے آگیا۔ سوٹ کیس اٹھاتے ہوئے اُس نے رکشاؤں اور اُنہیں چلانے والوں پر ایک نگاہ ڈالی، اک نئی سی رکشہ کا انتخاب کرنے کے بعد اُس نے اپنا سوٹ کیس رکشہ کے پائیدان پر رکھ دیا۔ شبانہ ہڈ کا ہینڈل پکڑ کر رکشہ پر سوار ہوئی تو اُسنے سوچا۔

نہیں ــــ بابا، امّی اور خالہ جان غلط کہتے ہیں۔ یہ تو اچھی بھلی ہے۔ باؤلے کہیں احتیاط سے کام لیتے ہیں۔ پھر ..... پھر آخر اسے کیا ہو جاتا ہے؟

رکشہ چل پڑا تھا، کریپ کے برقعہ کی جالی سے شبانہ کی کٹورہ سی آنکھیں بائیں طرف زمین پر پڑنے والے رکشہ کے اگلے پہیے کے سائے پر جمی ہوئی تھیں، اور وہ سوچ رہی تھی، چچی کے بغیر اب گھر کیسا لگے گا؟ چچی ذکو کا خیال آتے ہی ان کا سراپا شبانہ کے تصور میں ابھر آیا۔ چوڑی دار پائجامہ، سفید ململ کا کرتا۔ دوپٹے کا پلّو سر پر قرینے سے جما ہوا، ہونٹوں پر پان کی سرخی، اور گلے میں پڑی چاندی کی دیڑھ انچی تلوار، جس سے وہ خلال کیا کرتی تھیں

"اے لونڈیا۔ ہوش میں رہا کر، دوپٹے کی اچکلی سر پہ ڈال، ورنہ قسم جناب امیرؑ کی۔ اسی سے تیرا گلا نہ گھونٹ دیا تو ذکو نہ کہیو" اک دم سے اُسے اپنے کنوارپن کے دن یاد آ گئے۔

"رہنے بھی دیں چچی۔ کم بخت دوپٹے ہی ایسے آ رہے ہیں، جو سروں پہ نہیں رکتے"

اور اُس کے ساتھ ہی اُسے یاد آ گئی ایک اور آواز، اُس کے یاد آتے ہی دل کے کسی گوشے سے ڈھیر ساری نفرت بھی ابل پڑی۔ "کیوں آخر ایسا کیوں کیا ابّو نے؟"

رکشہ پلر نے ایک دم سے کاوا کاٹا تو دونوں ہی ہل کر رہ گئے۔ دونوں کے جسم آپس میں ٹکرائے۔

"بے وقوف کہیں کی" شوہر نے کنکھیوں سے بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا

"ذرا سنبھل کے بھائی ــــ شبانہ نے رکشہ چالک کو تاکید کی

"اجی گڑھا آ گیا تھا سورا

سڑک پر پڑنے والا رکشے کا سایہ کچھ اور دراز ہو چلا تھا، شوہر نے چہرے پر ابھر آنے والے ناگواری کے تاثرات چھپانے کی خاطر بائیں جانب کھڑے ایکوں کو دیکھنا شروع کیا۔ ابھی کھیت کا چھوٹا سا ٹکڑا ہی گزرا تھا کہ اُس نے سر گھمایا۔ ایک کسان بیل کے پیچھے پیچھے چلتا ہوا اُسے دکھائی دیا، اُس کے گلے میں ٹرانسسٹر پڑا ہوا تھا اور ریڈیو سے کافی بلند آواز میں گانا نشر ہو رہا تھا۔

"وقت نے کیا، کیا عجب ستم، تم رہے نہ تم، ہم رہے نہ ہم

نہیں! شائد بابا، امّی اور خالہ جان ہی ٹھیک ہیں، مجھے تو ان کا پورا گھر ہی باؤلوں کا لگتا ہے۔ شبانہ کا باپ کیا کسی پاگل سے کم تھا؟ بارہ سال پہلے جب خود میری شادی نہیں ہوئی

تھی اور ابّو، بابا سکھے کے ساتھ میرا رشتہ لے کر عبداللہ پور گئے تھے، تب شبانہ کے باپ نے بلا کوئی وجہ بیان کئے رشتہ نامنظور کر دیا تھا۔ اور ٹھیک بارہ برسوں بعد، جب میں تین بچوں کا باپ بن چکا اور میری بیوی مجھے داغ مفارقت دے گئی تو اس کی برسی سے پہلے ہی پھر ایک مرتبہ ابّو میرے بچّوں کو پالنے کی خاطر اسی عبداللہ پور میں میرا رشتہ لے کے پہنچے تھے اور جب انہیں علم ہوا کہ شبانہ آج بھی کنواری ہے تب ابو نے جھٹ سے نسبت طئے کی اور قریبی تاریخ طے ہوتے ہی خاموشی کے ساتھ میرا عقد ثانی شبانہ سے ہوگیا۔

سہاگ رات بس گذر گئی۔ دل دھڑکا ہوگا تو اس باؤلی کا دھڑکا ہوگا۔ مجھے تو اس رات رہ رہ کر یہ خیال پریشان کر رہا تھا کہ یہ لڑکی جو آج بلقیس کی جگہ اِس مسہری پر لیٹی ہے۔ کیا بلقیس اور میرے بچّوں کو ماں کا پیار دے سکے گی؟ مگر اس نے تو کمال ہی کر دیا۔ امراؤ، ظفر اور مختار تین مہینوں میں ہی بلقیس کو بھول گئے، بھول تو میں بھی اُسے گیا تھا۔ اور میں ہی کیا۔ بابا۔ امی اور خالہ جان۔ سب ہی اُسے بھلا بیٹھے تھے۔ کیونکہ شبانہ پر دورے جو پڑنے لگے تھے۔

پہلا دورہ شادی کے چار ماہ بعد پڑا تھا، جب ابّو کسی خیال میں کھوئے خلافِ عادت بلاگھٹکارے ہمارے کمرے میں داخل ہوگئے تھے، شبانہ کچھ ہی دیر پہلے غسلخانے سے نہانے کے بعد نکلی تھی، اور کمرے کے درمیان کھڑے ہوکر، اپنے بدن کو خم کئے تولیے سے زلفوں کا پانی جھٹک رہی تھی، ابّو کے کھکارنے پر وہ ایکدم سے اکڑوں بیٹھ گئی، اُدھر ابّو کا عجب حال تھا ان کے قدم گویا زمین پر چپک کر رہ گئے تھے۔

"جائیے، نکلیئے، باہر"

شبانہ چیخی تھی، امّی باورچی خانے میں ہنڈیا چولھا چھوڑ کر دوڑیں، اور خالہ جان اپنے کمرے سے، دونوں بہنوں نے دیکھا، ابو پسینے میں شرابور سر جھکائے دالان عبور کر رہے تھے، اور اندر کمرے میں شبانہ آپے سے باہر ہو رہی تھی۔ امراؤ، ظفر اور مختار، نئی ماں کا نیا روپ دیکھ کے سہم کر چوکی پر بیٹھ گئے تھے۔ امّی اور خالہ جان نے حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھا پھر اپنی اپنی سوالیہ نظریں ابّو کی طرف اٹھائیں، وہ آنگن میں نیم کے پیڑ تلے سر جھکائے مونڈھے پر بیٹھے اپنے دائیں پیر سے کچی زمین پر کبھی ایک لکیر کھینچتے اور دوسرے ہی پل دوسری عمودی لکیر سے اُسے کاٹ دیتے۔

شام کو جب میں گھر میں داخل ہوا تب مجھے علم ہوا کہ شبانہ کو دورہ پڑا تھا۔ رات کے

کھانے کے وقت امّی نے جب سینی میں ابو کے لیے کھانا اتار کر شبانہ سے کہا کہ جاؤ اسے اپنے ابوّ کے کمرے میں پہنچادو تو وہ نفرت سے امی کو دیکھنے لگی تھی ۔ میں نے صورت حال کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے اُسے اپنے کمرے میں بھیجا اور خود سینی اٹھاکر ابوّ کے سامنے پہنچا۔ وہ اب بھی سر جھکائے بیٹھے تھے ۔

دوسرے دن عبداللہ پور پہنچ کر میں نے چچی ذکو سے شبانہ کے دورے کے بارے میں بتایا تو ان کا چہرہ فق ہوگیا۔

" کیا کہو ہو ۔ یہاں تو کبھی نا پڑا ، اُس پہ دورہ

عبداللہ پور میں شبانہ کے دوسرے عزیزوں سے بھی میں نے پوچھا۔ سب کا ایک ہی جواب تھا ۔ اور اُس روز جوابات کی یکسانیت نے بے اختیار مجھے یہ سوچنے پر مجبور کردیا کہ بابا سکھے نے مجھے پھنسا دیا ہے ۔ ایک پاگل یا نیم دیوانی لڑکی میرے پلے کردی گئی ہے ۔ لیکن ـــ بچوّں کے لیے تو وہ بے حد شفیق اور مہربان ماں ثابت ہوئی تھی ۔ خود میرے لیے وہ مثالی بیوی تھی ، امّی اور خالہ جان بھی اُس سے خوش تھیں اور خود شبانہ کو ان سے کوئی شکایت نہ تھی ۔ بس ابوّ .... کہیں ابوّ نے کوئی ...... نہیں ۔ ایسا نہیں ہوسکتا ۔ میرے لئے تو ایسا سوچنا بھی گناہ عظیم ہے ۔ پھر .... پھر کیا بات ہے ۔ ان کا سامنا ہوتے ہی شبانہ کی آنکھوں کی پتلیاں جائے پناہ کیوں تلاش کرنے لگتی ہیں ؟ ہونٹ کیوں پھڑپھڑاتے ہیں ۔ اور وہ کیوں چیخ اٹھتی ہے ؟

" ہٹیئے ۔ سامنے سے ۔ جائیے ۔

شبانہ کے مخاطب کرنے پر وہ چونکا، اُس کی طرف دیکھنے سے پہلے اُس نے سر اٹھاکر سامنے دیکھا۔ پلیا کے اُس پار عیدگاہ کے بلند مینار اُسے دکھائی دیئے ،عیدگاہ سے پرے عبداللہ پور تھا۔

" تم نے کچھ کہا

" جی

" کہو

" آپ برا تو نہیں مانیں گے

" برا ماننے والی بات ہوئی تو ضرور مانوں گا

" تو پھر مجھے کچھ نہیں کہنا

واقعی یہ باؤلی ہے۔ اُس نے سوچا ــــ اور دونوں اُس وقت تک ایک دوسرے کو دیکھتے رہے، جب تک رکشہ والے نے اسے مخاطب نہیں کر لیا۔

" عبداللہ پور تو آگیا ہے گا باؤ جی۔ آپ اسٹینڈ پر اتریں گے یا ....

" میاں سجاد کی کوٹھی پر اتار دو۔ وہ جو مقبرے کے پاس ہے

دو منٹ بعد دونوں چچی ذکّو کے مکان میں بیٹھے تھے۔ چچی کے دونوں بیٹے، بہوویں ان کے گرد بیٹھے تھے، سب کی نگاہیں شبانہ کو ٹٹول رہی تھیں، چچی ذکّو کا بڑا بیٹا چہلم کا پروگرام بتانے لگا۔ مغرب بین کے بعد بڑی سی سینی میں دو عدد نان، ایک پیالے میں آلو گوشت کا سالن، چھوٹی سی پرچ میں زردہ اور ایک پیالے میں فیرنی رکھنے کے بعد اُس پر خوان پوش ڈھک دیا گیا۔ چچی ذکّو کے سارے بچے، اور وہ خود سینی لے کر قبرستان پہنچے سینی چچی کی قبر پر رکھ دی گئی، وہیں فاتحہ دی گئی اور مسجد کے موذن کو فاتحہ کا کھانا دینے کے بعد وہ سب گھر لوٹ آئے۔ سب نے محسوس کیا، چچی ذکّو آج ہی تو پی گئی ہیں۔ رات کے گیارہ بجے تک ہر پھر کر اُن ہی کا ذکر ہوتا رہا۔ وہ قدرے بے دلی کے عالم میں ان کے درمیان بیٹھا ہوں ہاں کرتا رہا نیند سے بوجھل ہوتی ہوئی اُس کی پلکوں پر سب سے پہلے بڑی بہو کی نظر پڑی، اُس نے اپنے میاں کو اشارہ کیا، سب خاموشی سے اٹھ گئے، ان دونوں کے لیے بڑی بہو نے اپنا کمرہ خالی کر دیا۔ بستر پر لیٹتے ہوئے اُس نے کپڑے بدلتی ہوئی شبانہ کو دیکھا تو یکایک اُس نے سوچا۔ کہاں سے شروع ہوتا ہوگا باؤلاپن؟ لاؤ، آج اسی سے کیوں نہ پوچھ لوں

" شبّو

" جی

" یہاں آؤ

" قمیض تو بدل لوں

" یوں ہی آجاؤ

" کوئی آجائے تو

" کوئی نہیں آتا۔ تم آؤ۔ یوں بھی شہمیز میں نچ رہی ہو

شبانہ نے مسکرا کر اُس کی طرف دیکھا، دو قدم بڑھائے اور اُس کے پہلو میں جا بیٹھی

" ایک بات بتاؤ گی

" پوچھیے

"تمھیں ..... میں اچھا لگتا ہوں ؟
جواب میں شبانہ مسکرانے لگی۔
" بتاؤنا
" یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے
" پھر
" یہ تو ـــــ سمجھنے کی بات ہے۔ جان لینے کی بات ہے
" سمجھتا بھی ہوں اور جانتا بھی
" پھر کیوں معلوم کر رہے ہیں ؟
" میں تمھارے منھ سے سننا چاہتا ہوں
شبانہ نے غور سے اپنے میاں کو دیکھا، پل بھر کے لیے کچھ سوچا پھر ہاتھ بڑھا کر پلنگ کی دوسری پٹی تھامی اور جھکنے کے بعد اُس کے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ دئے
" مل گیا جواب
" زبان سے کہو
شوہر کے اصرار پر شبانہ سنبھل کر بیٹھ گئی۔ اور اُس سے مخاطب ہوئی
" میں ایک بات پوچھوں
" ہاں، پوچھو
" مرد جانتے ہیں، ان کی بیوی انہیں چاہتی ہے، پھر بھی وہ بیوی کی زبانی سننے کی خواہش کیوں کرتے ہیں ؟
یہ کسی باؤلی کا سوال ہے ؟ ذہن میں ایک خیال سوال بن کر ابھرا اور فوراً ہی اُس کا جواب بھی ذہن نے نفی میں دے دیا
" پتہ نہیں۔ مردوں میں یہ خواہش کیوں پیدا ہوتی ہے
" میں بتاؤں
" تم جانتی ہو ؟
" ہاں
" تو بتاؤ

"آپ برا مان جائیں گے"

"نہیں مانوں گا۔ چلو بتاؤ"

"مردوں کو عورت کے دل میں جھانکنا نہیں آتا۔ اس لئے"

"ہوں"

ہنکاری بھرتے ہوئے شبانہ کے لئے اُس کے دل میں بے پناہ محبت اُمڈنے لگی، کتنی رسائیت اور اعتماد سے اُس نے گر کر بات اُسے بتا دی تھی۔

"ایک بات اور کہوں"

"ہاں کہو"

"سمجھ دار مرد کو اپنی بیوی سے اس طرح کا سوال نہیں کرنا چاہیئے"

"کیوں"

"شوہر کا سوال، بیوی کے ذہن میں وسوسے کو جنم دیتا ہے"

"اوہ تو۔۔۔ نہیں یہ پاگل نہیں ہو سکتی۔ تو، تو پھر اُن دوروں کی کیا حقیقت ہے؟ سوال، اُس کے ذہن کی حساس ترین نس میں اتر کے رہ گیا۔ اُس نے بے چارگی سے شبانہ کو دیکھا اور پھر سوال کی اذیت سے نجات کی خاطر بات کا سلسلہ آگے بڑھایا۔

"تو کیا تمہارے دل میں، میرے لئے شک پیدا ہو گیا۔"

"ابھی تو نہیں"

"کب تک ہو گا"

اُس کا سوال سُن لینے کے بعد شبانہ نے مسکراتے ہوئے اُسے دیکھا اور بڑی محبّت بھری آواز میں اُس سے پوچھا'

"یہ آج آپ کیسی باتیں کرنے لگے؟"

شبانہ کے سوال کا اُس نے فوراً کوئی جواب نہیں دیا۔ بلکہ وہ ذہن میں پہلے سے موجود اصل بات کے اظہار کی خاطر مناسب الفاظ تلاش کرنے لگا تھا۔ کافی دیر بعد شبانہ سے نظریں چراتے ہوئے اُس نے کہا

"دراصل ۔۔۔۔ مجھے ۔۔۔۔ ابّو کے بارے میں، تمہارے رویّے نے یہ سوال کرنے پر مجبور کر دیا ہے

اپنی بات کے خاتمے پر اُس نے محسوس کیا کہ اُس کا ذہن خاصا ہلکا پھلکا ہو چکا ہے۔ اُس نے نظروں کا زاویہ بدلا تب اُس نے دیکھا۔ ایک سایہ شبانہ کے چہرے پر آ کے گزر گیا۔ اب شبانہ غور سے اُسے دیکھ رہی تھی

اور وہ پھر ایک مرتبہ اُس سے نظریں چرانے پر خود کو مجبور پا رہا تھا۔ شبانہ اُسے غور سے دیکھتے ہوئے اُس کے برابر ہی لیٹ گئی۔ کچھ لمحے بعد اُس نے تھکی سی آواز میں کہنا شروع کیا۔

"جانے۔ مجھے ــــ کیا ہو جاتا ہے۔ انہیں دیکھتی ہوں تو ان کی آنکھوں سے ڈر لگتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے، جیسے وہ نظریں میرے سراپے میں، اپنی کوئی ..... کھوئی ہوئی شئے تلاش کر رہی ہیں۔ اور اُس کے میں آپے میں نہیں رہتی۔

"کیا بکواس ہے؟

اُس کی بلند آواز کی کرختگی پر شبانہ سہم گئی۔ تیزی سے کروٹ بدل کر اُس نے میاں کی بغل میں منھ چھپا لیا اور سسکتے ہوئے بولی

"میرا یقین کیجئے

"تم۔ بھول رہی ہو کہ وہ میرے ابّو ہیں۔ اور تمہارے سسر۔ تمہارے بھی باپ ہی سمان ہیں وہ۔

"ہاں ہیں

شبانہ نے دو لفظ لخت لخت ادا کیے اور گھٹی ہوئی آواز میں رونے لگی۔ اُس کا میاں کچھ دیر تو خاموشی سے اُسے دیکھتا رہا۔ پھر اُس کا سر سہلاتے ہوئے اُس سے مخاطب ہوا۔

"تم ...... تم گھبراؤ نہیں ...... سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ایسا کریں گے۔ کل کو۔ جب یہاں سے روانہ ہوں گے تو بس اڈّے جانے سے پہلے ....

اُس نے عمداً بات مکمل نہ کی۔ شبانہ نے بغل سے منھ نکال کر استفہامیہ انداز میں سسکتے ہوئے شوہر کو دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں تو شوہر نے اُسے اپنے سے چمٹاتے ہوئے بات پوری کی

"بس اڈّے جانے سے پہلے ہم پیارے لال شرما اسپتال چلیں گے

"د ...... وہاں ..... کیوں

"دماغ کے ماہر کسی ڈاکٹر سے مل کر تمہاری بیماری کا علاج معلوم کریں گے

سبکتی ہوئی شبانہ کے ذہن میں شوہر کی تجویز نے دھماکہ کیا۔ پل بھر کے اندر ہی اُس میں ایک انقلاب سا آگیا۔ سبکنا چھوڑ کے وہ تیزی سے اٹھی۔ میاں کو غصّے سے دیکھا اور دوسرے پلنگ پر پڑی اپنی قمیض اٹھا کر پہنتے ہوئے خاصی بلند آواز میں بولی

"میں کیا باؤلی ہوں جو دماغ کے ماہر ڈاکٹر سے آپ میرا علاج کروانا چاہتے ہیں؟ ـــــ ◯

چھب

اُس کے انکار پہ چچی ذکّو آج پھر آپے سے باہر ہوگئیں

دائیں کلّے میں سے خاصا بھلا پان نکال کر پہلے تو انہوں نے اُسے کوڑی پہ پھینکا، پھر اُسے گھور کر دیکھنے کے بعد شبانہ کو نظروں کی میزان میں تولنے لگیں۔

بھتیج داماد کا انکار کوئی نیا نہ تھا۔ بچو لیے اچھّے بُرے ہر طرح کے رشتے لا رہے تھے، کچھ ایسے خاندانوں سے بھی شبانہ کا ہاتھ مانگا گیا تھا، جن کے شجروں سے چچی اچھی طرح واقف تھیں، مگر داماد تھا کہ ہر رشتہ ٹھکرائے جا رہا تھا۔ اس عرفان کے باوجود کہ اس کی بیٹی شبانہ خود بھی اپنی چچی کے فیصلے سے متفق ہے اور وہ یہ بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ چچی کی خواہش میں اس کی بیٹی کی خوشیاں مضمر ہیں۔

ایک اچٹتی سی نظر چچی اور شبانہ پر ڈالنے کے بعد وہ سوچنے لگتا ہے کہ ــــ چچی جہاں دیدہ ہیں، زندگی کے نشیب و فراز سے پوری طرح واقف، پھر بھی وہ میری مجبوری نہیں سمجھ پا رہی ہیں۔ ریحانہ کی یہی تو ایک نشانی رہ گئی ہے۔ جس کے پورے وجود میں ریحانہ موجود ہے۔ میں نے چچی کی بات مان لی تو میری زندگی میں رہ ہی کیا جائے گا؟

"مجھے تو لگتا ہے، عرب جاکر تیری مت ماری گئی۔ جانے سے پہلے جی ہاں، جی ہاں کیا کرتا تھا اور اب ..... اب ناکی چاٹ کھا کے لوٹا ہے۔ میری مان۔ اس جوان مری کے ہاتھ پیلے کر دے۔"

اُس نے سر اٹھا کے چچی کے چہرے پہ نگاہ ڈالی، جہاں خفگی اب بھی موجود تھی۔ جس بھتیجی کی پرورش میں انہوں نے دن رات کا امتیاز ختم کر دیا تھا۔ اُسی کو وہ اب محض اِس لیے کوس رہی تھیں کہ اُس کا باپ آئے ہوئے رشتے ٹھکرا رہا تھا۔

"اب بھی کچھ نہیں بگڑا بالے ــ ڈھنگ کے رشتے آ رہے ہیں۔ یہ بھی ساداتِ بارہہ کا رشتہ ہے۔

اچھے لوگ ہیں۔ اسی طرح انکار کرتا رہا تو بہت دیر ہو جائے گی اور ..... اللہ نہ کرے ..... ہماری بچی کو دوسروں کے جنے پالنے پڑیں گے۔"

انہوں نے بات پوری کرنے کے بعد گلے میں پڑی چاندی کی ذرا سی تلوار سے دانتوں میں خلال کرتے ہوئے اپنی سوالیہ نظریں داماد پر مرکوز کر دیں۔

ان نگاہوں کا مطلب وہ اچھی طرح جانتا ہے۔ چچی کا یہ انداز اس کے لیے نیا نہیں۔ پچھلے آٹھ برسوں سے وہ اسے اسی انداز میں دیکھتی رہی ہیں۔ ان باتوں کا اس نے کبھی بُرا بھی نہ مانا ہے۔ چچی البتہ اس کی خموشی سے چڑ جاتی ہیں۔ اس وقت بھی وہ جھلا گئیں۔ انہوں نے عجیب سے انداز میں منہ بناتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھا۔ دالان کے کولے سے لگی کھڑی شبانہ پر نگاہ پڑتے ہی وہ درشت لہجے میں اُس سے مخاطب ہوئیں۔

" اے لڑکی۔ تیرے دیدوں کا پانی کہاں جا مرا۔ کولے سے لگی باتیں سُن رہی ہے۔ جا گھر چلی جا۔ بہو نے دودھ لے لیا ہوگا۔ وہ لے آ۔"

شبانہ نے حسرت بھرے انداز میں پہلے تو چچی کو اور پھر اپنے باپ کو دیکھا اور سر جھکا کر دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

" ارے بالے۔ میں کچھ پوچھ رہی ہوں تجھ سے۔ وہ کل لوٹ جائیں گے۔ آخر۔ تیرے انکار کی وجہ تو سمجھ میں آئے۔"

" رشتہ اچھا ہے چچی۔"

" پھر۔"

" ابھی ..... شبانہ کی ..... عمر ہی کیا ہے!"

" اے لو۔ اور سنو۔ اٹھارہ سال کی تھی جب تو پلٹا تھا عرب سے۔ اور اب۔ جناب امیرؑ کے صدقہ۔ تجھے آئے بھی تو آٹھ برس ہو لیے یوں۔ پُورے چھبّیس سال کی ہو لی لونڈیا۔ اور۔ تو کہہ رہا ہے ابھی اس کا سن ہی کیا ہے؟ میرے تو اس عمر میں چا ......"

بولتے بولتے چچی چُپ ہو گئیں۔ شاید اس خیال سے کہ بھتیج داماد کے سامنے اپنے گُن گانا مناسب نہیں۔ کچھ دیر تک وہ استفہامیہ انداز میں اُسے دیکھتی رہیں۔ پھر شکست کا احساس پیدا ہوتے ہی ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے بولیں:

" جانے۔ تیرے دماغ میں کیا ہے۔ میں جا رہی ہوں ..... شمس الحسن کے لونڈے کا جی ٹھیک

نہیں ۔ اُسے ڈاکٹر کے پاس لے جاؤں گی ۔ پر تو ایک بار پھر سوچ لے ۔"

"ہوں ۔"

بس ۔ ایک ہلکی سی ہنکاری کی آواز اُس کے منہ سے نکلی تھی اور ایک دم سے اس کی ذہنی رو چھبیس برسوں کا فاصلہ طے کر گئی ـــــ وہ سوچنے لگا :

طبیعت کس قدر پریشان تھی اُس روز ۔ ریحانہ دردِ زہ میں مبتلا تھی ۔ دائیوں نے ہاتھ کھینچ کر اُسے شہر لے جانے کی صلاح دی تھی ۔ کتنی ہی پریشانیوں کے بعد انور علی کی جیپ میں ڈال کر اسے شہر لے گیا تھا ۔ اور، رات کے دوسرے پہر جب شبانہ کی چیخ میرے کانوں سے ٹکرائی تو خوشی میرے روم روم سے پھوٹ پڑی تھی ۔ باپ بن جانے کے احساس نے خوشیوں کے جس دفینے تک مجھے پہنچایا وہیں ایک سانپ بھی موجود تھا ۔

ساس، سسر اور چچی نے مجھے اپنے گھیرے میں لینے کے بعد بتایا کہ شبانہ کو جنم دیتے ہوئے ریحانہ کی جیون جوت بجھ گئی ۔ ساس، سسر اور چچی کے سامنے آنسو بھی نہ بہا سکا تھا ۔ اس وقت تو مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ میرا غم ان کے غم سے بہت چھوٹا ہے ۔ ریحانہ میرے گلشنِ حیات میں بہار کے جھونکے کی طرح آئی اور چلی گئی ۔ لیکن بہار کا یہ جھونکا، ان کی زندگی کا حاصل تھا ۔ اکلوتی جوان بیٹی کے اس طرح دنیا سے اُٹھ جانے کا صدمہ سسر برداشت نہ کر سکے ۔ ساس کے دکھ کی شدت شبانہ کی قلکاریوں نے کم کر دی ۔ بڑا عجیب وقت تھا وہ ۔ ہم میں سے کوئی بھی کسی کو پرسہ نہیں دے سکا تھا ۔

لوگ کہتے ہیں بیوی کی موت کا غم گھٹنے کی چوٹ کی طرح ہُوا کرتا ہے ۔ چوٹ لگی، درد اُٹھا، کچھ روز رہا ۔ اور پھر یاد بھی نہ رہا کہ کبھی چوٹ لگی تھی، درد اٹھا تھا ۔ لیکن میرا حال دوسرا تھا ۔ ریحانہ کے اس طرح چلے جانے کا دکھ بڑا شدید تھا ۔ دن بہ دن میرے حواس مختل ہوتے رہے اسی پریشانی کے عالم میں میری ملازمت جاتی رہی ۔ سسرالی عزیز البتہ میری دلجوئی کرتے رہے ۔

ایک دن ـــ ایک عزیز نے بتایا محکمہ روزگار کے دفتر میں پرچہ لگا ہے کہ عرب دیس میں ملازمتوں کے خواہش مند افراد آکر متعلقہ افسر سے فارم حاصل کر سکتے ہیں ۔ اُسی عزیز کی ایماء پر اور چچی و ساس کے بے حد اصرار پر میں نے فارم بھر دیے ۔

چار پانچ ماہ بعد ہی مجھے ملک چھوڑنا پڑا ۔ بحرین میں امریکن کمپنی میں کام کرتے ہوئے بھی کبھی میں ریحانہ کو نہ بھلا سکا ۔ بالخصوص رات کی تنہائی اور ایئر کنڈیشنڈ کے خنک ماحول میں

ریحانہ مجھے شدّت سے یاد آتی رہی ۔ ہر ماہ ، اپنی ساس کے نام میں ڈرافٹ بھیجتا رہا۔

اٹھارہ برس اس طرح گزر گئے جیسے اٹھارہ مہینے ۔ ان اٹھارہ برسوں میں پچاسوں خطوں میں ساس نے شبانہ کی بابت لکھا۔ ہر خط میں ایک بات مشترک تھی۔ شبّو میری ریحانہ پر گئی ہے۔ ناک نقشہ ، چال ڈھال ، بولنے کا انداز ، اس نے سب کچھ اپنی ماں سے پایا ہے ۔ اٹھارہ برسوں بعد جب پہلی مرتبہ چچی ذکّو اور شبانہ کے خط اُسے ملے تب اُس نے فیصلہ کیا کہ اب لوٹ جانا بہتر ہے۔

اور جب اٹھارہ برس چند ماہ بعد وہ گاؤں لوٹا تھا تو اک انقلاب آچکا تھا۔ اب وہ گاؤں، شہر کے ایک محلّے میں تبدیل ہوکر رہ گیا تھا۔ سفید کرتے پجامے میں ملبوس کوٹ کے میر صاحبان اب بھی حسبِ عادت رعیّت کے سلام کی وصولی کی خاطر صبح صبح گھر سے نکلتے ، پر اب کوئی انہیں میاں سلام اور میر صاحب آداب کہنے والا نہ تھا۔ جوہڑ کنارے آباد کمین زادے اب انہیں دیکھ کر راستہ سے ہٹنے کے بجائے سڑک کے بیچوں بیچ کھیلتے رہتے ، اور میر صاحب اندر ہی اندر پیچ و تاب کھاتے ہوئے گھر لوٹ جاتے ۔

گھر کا دروازہ شبانہ نے کھولا تھا۔ اُسے غور سے بلا پلکیں جھپکائے دیکھنے کے بعد وہ، ابّو کہہ کر اُس سے لپٹ گئی تھی ..... مجھے اچھی طرح یاد ہے ..... اُس پل مجھے لگا ..... مجھ سے شبانہ نہیں ریحانہ لپٹی ہوئی ہے ۔ اور غلطی سے اس نے مجھے ابّو کہہ دیا ہے ..... کافی دیر تک میں اُسے بھینچے ہوئے کھڑا رہا تھا۔ خود شبانہ بھی مجھ سے الگ نہیں ہو رہی تھی۔

چچی ذکّو کے مخاطب کرنے پر ہی وہ دونوں ہوش میں آئے تھے ۔ باپ کے گھر آنے کی خوشی اُس کی رگوں میں دوڑتے خون میں گھل گئی چڑیا کے مانند پھدکتی پھر رہی تھی شبانہ ۔ کبھی باورچی خانے میں ۔ کبھی ماں کی خواب گاہ میں ۔ کبھی اُسے چار پہ چار پلانے میں مصروف تو کبھی اپنی ماں کی تصویروں کا البم دکھانے میں مشغول ۔ چپلّوں کا ہوش ۔ نہ دوپٹّے کا ۔ دوپٹّہ تھا کہ کم بخت بار بار سر سے ڈھلک رہا تھا اور خود اس کا دِل بھی یہی چاہتا تھا کہ شبانہ کا دوپٹّہ بار بار سر سے ڈھلکتا رہے اور...

اٹھارہ برس کی الّھڑ لڑکی باپ کو پاکر والہانہ انداز میں اس سے لپٹ جاتی ۔ اُس کے گلے میں بانہیں ڈال دیا کرتی ، اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنی ماں کے بارے میں پوچھتی ۔ کبھی نانی کی کسی بات کی تصدیق ، تو کبھی چچی ذکّو کے بیان کی توثیق ۔ اِسی طرح دن گزرتے رہے شبانہ باپ کو پاکر پھولی نہ سما رہی تھی اور وہ ـــ دانستہ اور کچھ نادانستگی میں اپنی آنکھوں کی ٹھنڈک کو دل کے اس نہاں خانے میں جگہ دیتا رہا جہاں آج تک ریحانہ کی یادوں کے مُرقعے سجے ہوئے تھے ۔ جب جب شبانہ دسترخوان

پہ نعمتیں چُنتی اور بے خیالی میں اُس کے سر سے آنچل سرکتا تو وہ ..... ایک دم سے ان راتوں کو یاد کرنے پر مجبور ہو جاتا جب خواب گاہ میں وہ اور ریحانہ ایک دُوسرے میں سما جانے کی کوششوں میں نڈھال ہو جاتے تھے .....

ایک آدھ بار نانی اور چچی کی موجودگی میں بھی اُس کے سر سے آنچل پھسلا تو حسبِ عادت نانی نے اُسے ڈانٹا:

"اے لونڈیا۔ ہوش میں رہا کر، ورنہ اسی دوپٹے سے تیرا گلا گھونٹ دوں گی۔"

"نانی اماں، پھسل پھسل جاتا ہے۔"

"بال پن لگا اس میں۔"

"چھوڑیں بھی امّی! زمانہ ہی بدل گیا ہے۔ دوپٹے چکنے آنے لگے۔ سر پہ ٹھہرتے ہی نہیں کم بخت۔"

دل میں موجود خواہش سے مجبور ہو کر اُس نے شبانہ کی طرفداری کی تو ساس نے گھور کر اُسے دیکھا اور دوسری طرف منہ پھیر کر لاحول پڑھنے لگیں۔ لیکن چچی ذکو سے برداشت نہ ہوا تو وہ بول اٹھیں:

"زمانہ بدل گیا ہے۔ یہ سب تُو ہی بھیجتا رہا ہے عرب سے۔ اُتّے مارے۔ کپڑے ہیں یا مکھن کے تھان ..... جھولو مارا، سارا بدن دِکھائی دیتا ہے۔"

چچی کی بات اُس نے دائیں کان سے سُنی اور بائیں کان سے نکال دی۔ اس لیے کہ اس کے دل میں خود یہ خواہش جڑ پکڑ چکی تھی۔ کہ وقت بے وقت شبانہ کے سر سے دوپٹہ پھسلتا رہے۔ جانے انجانے۔ خود شبانہ بھی اس جڑ پر تکمیل کی برکھا کرتی رہی۔ اُدھر پلنگ پر لیٹی ساس اپنی نواسی کے طور طریقے دیکھ دیکھ کر اندر ہی اندر کڑھتی رہیں۔

اسی دوران دو تین رشتے بھی آئے جن میں مین میخ نکال کر ان کے داماد نے بات ختم کر دی۔ پانچواں رشتہ جب اُس نے رد کر دیا تو ان سے نہ رہا گیا۔ بچولیے کے چلے جانے کے بعد انہوں نے اپنے داماد سے کہا:

"ہر نماز میں ایک ہی دُعا کرتی رہی کہ پاک پروردگار بی بی کے صدقہ ساتھ خیریت کے اسے اس کے گھر کی کر دے۔ اب، میری زندگی کا کیا بھروسہ؟ میری مان ــــ آنکھیں بند ہونے سے پہلے اس کے ہاتھ پیلے کر دے۔ لڑکی ذات کا کوئی بھروسہ نہیں۔ لڑکی اور مچھلی میں کیا فرق ہے؟ ذرا گرفت ڈھیلی ہوئی اور یہ جا وہ جا ..... سُن رہا ہے نا تو؟"

لیکن وہ کہاں سُن رہا تھا۔ وہ تو سوچ رہا تھا کہ یہ اماں کیا کہنے لگیں۔ ان کی مان لوں تو شبانہ میری نگاہوں سے دُور ہو جائے گی، اور پھر اٹھتے بیٹھتے میں ریحانہ کو نہ دیکھ سکوں گا۔

"ارے تُو بولتا کیوں نہیں؟"

"سوچوں گا اس بارے میں"

"سوچوں گا اس بارے میں؟ بھلے مانس۔ بچّی جوان ہے۔ رشتے آرہے ہیں۔ بسم اللہ کردے۔ دیر ہوگئی تو پھر پچھتائے گا۔"

میں کیوں پچھتانے لگا۔ اس نے سوچا ..... دیر ہوتی ہے تو ہوتی رہے۔ اس مسئلہ پر جتنی دیر ہوگی میرے حق میں مفید ہوگی۔ کب تک آئیں گے رشتے ۔۔؟ دو۔ چار۔ آٹھ۔ دس۔ بس ..... پھر شبانہ ہوگی اور میں ..... اور .....

وقت دبے پاؤں گزر ہی گیا۔ ساس شبانہ کی شادی کا اصرار کرتے کرتے اپنی بیٹی سے جا ملیں اور اب تو شبانہ کا رویّہ بھی تبدیل ہو چکا تھا۔ اُس کی طبیعت میں متانت جگہ پا چکی تھی۔

ایک روز جب اس نے شبانہ کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر اُسے اپنے سے لپٹانے کی کوشش کی تو وہ کسمسا کر علاحدہ ہوگئی ۔۔ اور اس روز پہلی مرتبہ اس نے شبانہ کو اپنی جانب دزدیدہ نظروں سے دیکھتے ہوئے پایا تھا۔

سلیپچی رکھنے کی آواز پر چونکنے کے بعد اُس نے شبانہ کو دیکھا۔ وہ جرمن کا لوٹا لیے اُس کے ہاتھ دھلوانے کے لیے کھڑی تھی۔ پلنگ پر کب اس نے کھانے کی سینی رکھ دی تھی اُس کا اسے علم ہی نہ ہو سکا تھا۔

ہاتھ دھو کر، دستری سے پونچھتے ہوئے اُس نے شبانہ سے ساتھ ہی کھانے کے لیے کہا تو اُس نے نظریں چراتے ہوئے انکار کر دیا، اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی باورچی خانے کی طرف بڑھ گئی۔

رات کے تیسرے پہر اُس کی آنکھ کھلی تھی۔ تکیہ کے برابر سے سگریٹ کا پیکٹ اُٹھا کر اس نے ایک سگریٹ ہونٹوں میں دبائی، اور لائٹر سے جب اُسے جلانے لگا تو بے اختیار اس کی نظریں دالان میں بچھے نواڑ کے پلنگ پر سوئی ہوئی شبانہ پر پڑ گئیں۔

اُس کا سر تکیہ سے نیچے ہو گیا تھا۔ دونوں پیر مخالف سمتوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ ایک ہاتھ چھاتی پہ تو دوسرا سرہانے کی طرف۔

پلنگ کے نیچے سے لوٹا اٹھا کر وہ غسل خانے کی طرف بڑھا۔ رات بے رات پیشاب کرنے

کی خاطر غسل خانے میں ہی دو اینٹیں رکھ کر عارضی طور پر قدمچے بنا لیے گئے تھے۔ قدمچوں پہ بیٹھتے ہوئے بھی اُس کی آنکھوں میں شبانہ کا سراپا سمایا ہُوا تھا۔

دو منٹ بعد جب وہ کمر بند میں گرہ لگا رہا تھا تو اُس کی نگاہ چارپائی کے سیروے پر پڑے شبانہ کے میلے کپڑوں پر پڑ گئی۔ آج شام نہانے کے بعد شبانہ غسل خانے سے چارپائی ہٹانا بھول گئی تھی۔

ایک نگاہ دالان کی طرف ڈالنے کے بعد اس نے ہاتھ بڑھا کر کپڑے اٹھا لیے۔ اور اپنے پلنگ کی طرف بڑھ گیا۔ پلنگ کے نیچے لوٹا رکھتے ہوئے بائیں ہاتھ میں موجود شبانہ کے کپڑے اُس کی ناک سے ٹکرائے تو اس نے ان کپڑوں میں ایک جانی پہچانی بو محسوس کی پسینے اور میل کی ملی جلی بو۔

"یہ تم میری بغل میں منہ دے کر کیوں لیٹا کرتے ہو؟"

"سچ سچ بتاؤں؟"

"ہوں۔"

"تمہاری بغل سے پھوٹتی بو مجھے اچھی لگتی ہے۔"

"اچھی"

"سچ۔ تمہارے سر کی قسم۔"

"توبہ ہے۔"

ایک دم سے اُسے بہت کچھ یاد آتا چلا گیا۔ اور تخیل کے پردے پر ریحانہ و شبانہ کے چہرے گڈمڈ ہونے لگے۔

سیدھے کھڑے ہونے کے بعد اس نے پھر شبانہ کی طرف دیکھا۔ وہ اُسی انداز میں پڑی ہوئی تھی۔ زیرو والٹ کی مدھم روشنی میں شبانہ کی آنکھوں کے نیچے پیدا ہونے والے سیاہ حلقے اُسے صاف طور پر دکھائی دے رہے تھے۔ فوراً ہی اسے یاد آیا کہ بحرین سے واپس آنے پر جب پہلی مرتبہ شبانہ کو دیکھا تھا تو یہ حلقے اس کے چہرے پر موجود نہ تھے۔

اور اس کے یاد آتے ہی اُس کے ضمیر نے ذہن میں کچوکے لگانے شروع کر دیے کہ ــــ تو محض اپنی سفلانہ خواہشات کی خاطر پھول جیسی زندگی کو اس کی فطری لطافتوں سے محروم کر رہا ہے۔ اپنی شادی شدہ زندگی کے اٹھارہ مہینوں میں تو نے خود تو زندگی کا ہر لطف حاصل کیا تھا اور آج جب کہ تیری بیٹی کے دن ان نعمتوں سے فیض یاب ہونے کے ہیں، تو اُس پر ظلم کر رہا ہے۔

اس کے دل و دماغ میں جنگ ہو رہی تھی۔ اُس کا ذہن میدانِ کارزار بنا ہُوا تھا۔ سفلانہ خواہشات کے غضب ناک گھوڑے اس طوفانی رفتار سے دوڑ رہے تھے کہ حقیقت پسندی کے ہیولے بار بار ان کی ٹاپوں تلے رُندتے جا رہے تھے۔ بالآخر وہ گھوڑے دوڑتے دوڑتے تھک کر گر پڑے اور .....

"ابوجی ...... آپ ..... اس وقت اور ......"

شبانہ نے سر پر دوپٹہ رکھتے ہوئے اسے چونکنے پر مجبور کیا۔

"ہاں میں ــــ تم سو جاؤ ...... اور صبح ...... چچی ذکو کو بلوا لینا۔"

صبح ناشتے کے موقع پر چچی ذکو، ان کے بیٹے شمس الحسن اور امامت نیز ان کی بیویاں بھی موجود تھیں۔ شبانہ اور شمس الحسن کی بہو ناشتہ پروس رہی تھیں اور چچی ذکو کہہ رہی تھیں:

"عترت حسین آج لوٹ جائیں گے۔"

"کہاں کے ہیں یہ ؟"

"تو ...... تو نے فیصلہ کر ہی لیا۔"

"ہوں ـ" رندھے گلے سے اس نے بے حد دھیمی آواز میں جواب دیا۔

"سادات بارہہ میں ایک بستی جٹواڑہ ہے۔ وہیں کے ہیں۔ لڑکا بی اے کر چکا ہے۔ دو سو بیگھے زمین ہے۔ گھر کا انجن ہے ــ ٹریکٹر ہے۔ یوں سمجھ۔ بہت ہی بھلے لوگ ہیں۔ اپنی بٹیا راج کرے گی۔"

"ہوں ـ"

"ارے ہوں، ہوں کیا کر رہا ہے ؟ صاف صاف جواب دے میں کیا کہوں ان سے ؟ کب منگواؤں امام ضامن ؟

اور اس سے پہلے کہ وہ صاف صاف جواب دیتا، شبانہ چائے کی ٹرے لے آئی۔ ٹرے رکھتے ہوئے اُس کے سر پر سے دوپٹہ پھسل کر لٹک گیا، اور اس کی نگاہوں میں پھر ایک بار ریحانہ کا جسم سما گیا۔

"کیا سوچنے لگا بالے ؟"

ناشتہ چھوڑ کر وہ اُٹھ گیا۔ پہلے اس نے چچی کو دیکھا، پھر ان کے بیٹوں اور بہو کو اور آخری نظر شبانہ پر ڈالی جو دوپٹے کا آنچل سر پہ ڈال رہی تھی اور چچی ذکو آج پھر آپے سے باہر ہو گئی تھیں۔

گھٹتے بڑھتے سائے

نوکری پانے کی مسرت اس کے ہونٹوں پہ رکی ہوئی تھی۔ یہ خوشی کچھ دیر اس کے چہرے کو اور کھلائے رکھتی، لیکن اپنے جھونپڑے کے دروازے پر پہنچنے کے بعد اُس نے جونہی چھینٹ کا پردہ ہٹایا تو آہستہ آہستہ اس کے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہوگئی اور ذہن کے کسی حصہ سے حیرت اُتر کر اس کا منہ کھول گئی ایک نگاہ بیوی پر ڈالنے کے بعد، بے اختیار اُس نے اپنے پیروں کو دیکھا، پھر چپّل دروازے کی طرف سرکا، چوبی دیوار سے لگے کھوکھے پر بیٹھ کر وہ غور سے بیوی کو دیکھنے لگا۔ ایک دم سے اُسے اپنی اور سکینہ کی پہلی ملاقات یاد آگئی، پہلی ملاقات پر اُس نے سکینہ سے جو باتیں کی تھیں، وہ یاد آئیں اور ..... یادوں کے دریچے کھلتے ہی چلے جارہے تھے کہ وہ سکینہ کی آواز پر چونکا۔ وہ پوچھ رہی تھی۔

"کبھی آئے؟

"آں۔ تھوڑی دیر آگل۔ پن ..... یہ .... آج تیرے کو کیا ہوا۔

"کیوں۔ کیا ہوا میرے کو۔ سکینہ نے معصومیت سے پوچھا

"تو نماز پڑھی آج

"ہاں۔ اک فخریہ مسکراہٹ سکینہ کو کھلا گئی۔ اس نے شوہر کے چہرے پر تحیر کے آثار دیکھے تو پوچھا

"تم کو اچھا لگا نا؟

"اچھا تو لگا۔ پن ..... ایک بات بول۔ پہلے بھی پڑھتی ہوتی نماز؟

شوہر کے سوال کا جواب سکینہ نے اثبات میں سر ہلا کر دیا تو اُس نے دوسرا سوال جڑ دیا۔

"اُدھر دلّی میں

ٹائل، ماربل، بجری، سیمنٹ کی جالیاں، چونے کی دکانیں، اسکوٹروں کے بکنے کی آوازیں، بہاری رکشہ پُڑوں کا شور ٹیمپو کے روتے ہوئے انجن، ٹھیلے والوں کی آوازیں۔ گنجان اور پرشور آوازوں کا میوزیم۔

جی۔ بی۔ روڈ۔ ایک لسورتی شام رات کے بالوں میں جھول رہی تھی جب کسی نے اس کی ہتھیلی پر بیس روپے کا نوٹ رکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

"نام کیا ہے تیرا؟

"سکینہ

"سچ سچ بتا

"سچ۔ یہی نام ہے۔ اور تمہارا؟

"قادر۔ قادر ہے میرا نام۔ بلند شہر کا ہوں۔ ممبئی میں مجوری کرتا ہوں

"مزدوری

"ہاں ہاں وہیچ۔ سالی زبان لفڑا کر دیتی ہے کر کے الٹا سیدھا ہو جاتا ہے۔

"تو پھر لاؤ۔ میری بخشش نکالو

"دو کتّے بولی تو'۔ وہ دیا تیرے کو۔ ابھی کام سے آگل بخشش۔ اچھا لے۔ یہ

پندرہ منٹوں کے اندر ہی اندر اک ذرا سے کرید نے پر قادر جان گیا کہ سکینہ نئی نئی اس جہنم میں داخل کی گئی ہے۔ کافی سوچ وچار کے بعد اُس نے سکینہ کے سامنے دانہ ڈال دیا تھا۔ اور سکینہ کے سر جھکاتے ہی اُس نے گُدّی پکڑنے میں کسی بھی طرح کے تساہل سے کام نہ لیا۔ دوسرے روز وہ دونوں ممبئی کے لئے سوار ہو گئے تھے۔ خرانٹ گھر والی اور بھڑووں کے لیے کئی سوالات چھوڑ کر

"کیا سوچ رہی

"میں کتّی بار بولی۔ دلّی کا نام نہیں لینے کا

"پن میں تو نماز کا پوچھا۔ تو' پھوکٹ میں منھ چڑھا رہی۔ کیا

"نہیں۔ اُدھر نہیں پڑھی کبھی۔ گانو میں۔ پڑھتی تھی۔ کبھی بھی

"آج ایک دم سے کیسے یاد آ گئی"

"آج۔ جماعت والے آئے تھے۔

"جماعت والے بولے تو ؟

"تبلیغی جماعت والے ۔ آٹھ دس آدمی ہوتے ۔ عورتیں بھی ہوتیں ان کے سنگ ۔ سب کو سمجھائے وہ لوگ ۔ نماز پڑھو ۔ نماز پڑھنے سے جنت ملتی اور بولے ۔ نماز بغیر کوئی نیکی اللہ میاں قبول نہیں کرتے ۔

سکینہ نے کچھ اس معصومیت سے بتایا کہ قادر مسکراتے ہوئے پوچھ بیٹھا

"ایسا کیا

"ہاں ۔ پھر وہ لوگ بولے ۔ رمضان شریف آنے والے ۔ اس مہینے میں روزے رکھنا ۔ کیوں کہ نماز کی طرح روزہ بھی واجب ہے ۔ اور یہ پورا مہینہ ۔ نیکیوں کا مہینہ ہے ۔ اس مہینے میں اللہ میاں اپنے بندوں کے گناہ معاف کر دیتے ہیں ۔

"اچ ۔ اچھا

غیر یقینی کے عالم میں قادر نے آنکھیں پھیلائیں ۔ پھر سکینہ سے ایک گلاس پانی مانگا ۔ ذرا سی دیر کے بعد پانی کا گلاس قادر کی طرف بڑھاتے ہوئے سکینہ بولی

"ایک بات بولوں

"ہاں بول

"رمضان آرہے ۔ یہ مہینے میں ۔ تم اقبال اور رؤف کے سنگ نہیں رہو گے

"کیا

قادر کی آنکھیں پھیل گئیں ۔ اُس نے گلاس ایک طرف رکھتے ہوئے غور سے سکینہ کو دیکھا پھر قدرے اونچی آواز میں بولا

"تیرے کو مالوم تو کیا بولی

"برابر معلوم ہے ۔ میں سوچ سمجھ کر بولی تم کو

"وہ دونوں میرے ساتھی ہیں ۔ کیا

حاجی کے ہوٹل میں وہ تینوں ہی ایک میز کے گرد بیٹھے تھے ۔ اقبال اور رؤف للچائے ہوئے انداز میں ان نوٹوں کو دیکھ رہے تھے جو قادر کی انگلیوں میں اِدھر سے اُدھر منتقل ہو رہے تھے ۔ چوتھی مرتبہ انہیں گننے کے بعد قادر نے کہا ۔

"پورے نوگز کیا۔
" واہ — رؤف نے اپنی خوشی کا اظہار کیا
"سب عبدالرحمٰن باوا کا کمال ہے۔کیا۔ اپن آج باوا کو بولا ہوتا۔عید آنے والی ہے باوا۔کچھ بندوبست کرو، کیا
" اور — باوا بندوبست کردیئے — اقبال نے بھی بات چیت میں حصہ لیا۔کچھ دیرادھر اُدھر کی بات چیت کرنے کے بعد قادر نے اقبال اور رؤف کو ان کے حصے کی رقم دے کر چلتا کیا۔
پھر گلے پر پہنچ کر حاجی صاحب کی طرف پانچ سو روپے بڑھاتے ہوئے ان سے پوچھا
" ابھی کتنے ہوئے حاجی ساب
"کیا روز روز ستاتا ہے قادر بھائی۔کل تو بتایا ہوتا۔۔۔تین ہزار دو سو روپے
" بھٹر کو مت حاجی ساب۔کیا — اور لو — یہ پانچ گز اور جمع کرو۔کیا — اور ہاں — ایک پلیٹ چکن بریانی پارسل۔کچومر کے ساتھ۔ اپنی گھر والی کے واسطے۔کیا۔

" رمضان آنے والے قادر — سکینہ نے ملائمیت سے اُسے مخاطب کیا۔
" تو پھر؟
" دیکھو۔ روزہ — تم پکڑتے نہیں، ہے نا
" پر وپر بولی تو،
" میں یہ مہینے میں — بولے تو رمضان میں۔غلط کام نہیں کرنے دوں گی تمکو
"کیا بول رہی تو، — ارے اپن ایچ کام جانتا ہے سالا۔تیرے کو تو مالوم۔مجوری۔
" غلط ہے وہ کام
" لے — ایچ دن میں جماعت والے تیری کھوپڑی بھرا دیئے۔
" ایسا مت بولو۔پھر یہ بھی مت بھولو۔کھوپڑی وہی بھرتی جو خالی ہو۔
" تو تیری کھوپڑی بھرلی ہے
" ہاں۔
"کیا ہے اس میں؟

"یقین ہے۔
"کیا بول رہی تو، اپن کا کھوپڑی میں نہیں آیا، کیا۔ تیرے جماعت والے.....
"اے۔ اے ــــ سکینہ نے آنکھیں پھیلائیں پھر غراتے ہوئے بولی "ڈر نہیں لگتا اللہ میاں سے؟
"ڈر۔ اللہ میاں ــ جماعت والے۔ کیا نفڑا ہے یار۔ تو، نے تو کھوپڑی پھرادی اپن کی۔ کیا

دماغ میں کروٹیں لیتی نفسانی خواہشات رگ و ریشہ سے سفر کرتی تکمیل کو پہنچی تو نڈھال ہوکر قادر گودڑی پر لیٹ گیا۔ اپنی بے ترتیب سانسوں پر قابو پاتا ہوا قادر۔ سکینہ کو کچھ زیادہ ہی پیارا لگا۔ اُس نے گودڑی کا سرا کھینچ کر اُس کی سلوٹیں دور کیں، پھر تکیہ اٹھا کر سرہانے رکھتے ہوئے قادر سے بولی
"موج کرلو۔ اور دو دن ہیں۔ رمضان میں یہ سب نہیں چلے گا۔
"کیا۔ جماعت والے اس کو بھی .....
"بڑے بے شرم ہو جی
"بول نا
"بولی نا۔ یہ سب نہیں۔ تو نہیں۔ بس
"کیا یار۔ ایسا کیا بولتی۔
"بولی نا۔ میرے کو رمضان میں اچھا کام کرنے کا
"واندے میں ڈالے گی تو، میرے کو۔ پن ایک بات تو بتا۔ تیرے کو کون بولا۔ یہ اچھا کام نہیں۔ ماں کسم۔ یہ خراب کام نہیں ہے۔
"پن میں سوچی، یہ بھی نہیں۔ خالی نماز۔ روزہ۔ اور محنت
قادر نے جھنجھلاکر کروٹ بدلی۔ اور بڑبڑانے لگا۔
"ارے تو بھی کمال کرتی ہے۔ مجوری نہیں کرنے کا۔ سنگ نہیں سونے کا۔ تو پھر کرنے کا کیا؟
اُس کی جھنجھلاہٹ پر سکینہ مسکرانے لگی۔ مسکراتے ہوئے سکینہ کے دماغ میں ایک خیال کوندا،

اور دوسرے ہی پل اُس نے قادر سے اُس کا اظہار بھی کر دیا

"اپن رمضان میں کیلے کی گاڑی لگائیں گے۔

"کیلا ۔ دھت ۔ سالے پاؤلی کے دس کیلے والے ملتے ۔ تیرے کو مالوم اکھی بمبئی میں بھیا لوگ دوچ کام کرتے ۔ بھنگار کا دھندہ اور کیلے کا دھندہ ۔ نہیں۔ اپن لوگ بھیا ہیں کیا ۔ کیلا ۔ ہُنھ۔

"پھر

"سوچیں گے ۔ ابھی دو دن ہیں ۔

کہنے کو تو قادر کہہ گیا ۔ پھر فوراً ہی اس کے ذہن میں خیالات کے گھوڑے دوڑنے لگے تھے۔ بھیگی ہوئی دال، کھجور، ککڑی، تربوز، شیرمال، دہی بڑے، خربوزہ، سوتیاں ۔ برف

"ہم پکوڑیاں بنائیں گے ۔

سارے خیالی گھوڑے اک دم سے رکے ۔ قادر نے غور سے سکینہ کو دیکھا، پھر آہستہ سے بولا

"بھجیہ بولتے اِدھر ۔ کیا

"ہاں ۔ ہاں، وہی ۔ بھجیہ بنائیں گے ۔

"پن ۔ بنائے گا کون

"میں ۔ اور کون ۔ اور ..... اور تم بیچو گے ۔ لوگ باگ روپے کی پانچ دیتے ہم چھے دیں گے۔

"واٹولا کرے گی تو ۔ ارے ۔ ابھی سے گٹر کرنے کا سوچ رہی تو'

"واٹولہ، گٹر ۔ ہنھ ۔ اے قادر ۔ ہمیشہ فائدے کی ہی سوچتے ہو ۔ ارے میری جان! رمضان کا مہینہ ہے ۔ نیکی کا مہینہ روزہ دار لوگ کھائیں گے ۔ بکری بھی زیادہ ہوگی ۔ اور ثواب بھی ملے گا ۔

سکینہ نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا ۔ لیکن اُس نے لفظ ثواب پر کچھ زیادہ ہی زور دیا تھا ۔ برسوں پہلے اپنے ماں باپ کی زبان سے اُس نے یہ لفظ سنا تھا ۔ یا پھر آج جماعت والوں نے اُس پر اس لفظ کی معنویت آشکار کر دی تھی ۔ اپنی بات کا ردِّ عمل جان لینے کی خاطر وہ خاموشی سے قادر کے چہرے کو دیکھتی رہی ۔ پھر آہستہ سے فیصلہ کن انداز میں اُس سے بولی ۔

"تم ۔ کل، کڑھائی، کرچھا، سگڑی اور کوئلے کا بندوبست کرو ۔ میں ۔ آلو، بیسن ۔ اردی کے پتے، اور مرچی کا انتظام کروں گی ۔

بہت سی باتوں سے اتفاق اور ایک آدھ سے اختلاف کے باوجود دونوں ہی بہر حال پکوڑیاں بناکر فروخت کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ اور اُس رات دونوں ہی حصولِ ثواب کے خوش گوار نتائج کے تصور میں غلطاں نیند کی وادیوں میں اتر گئے۔

چاندرات سے کچھ گھنٹے پہلے قادر نے حاجی ہوٹل جاکر حاجی صاحب کو اپنے فیصلہ کی اطلاع دی۔ اور ان کے پاس جمع اپنی ساری رقم واپس لینے کے بعد حاجی صاحب سے بولا

"اپنا ٹھیّا ادھر ہی لگے گا حاجی ساب۔ ہوٹل آگل۔ کیا

اگلے روز دوسرا پہر شروع ہوتے ہی میاں بیوی نے ہوٹل کے سامنے فٹ پاتھ پر دکان جمائی۔ سکینہ گھر ہی سے بیسن گھول لائی تھی۔ فٹ پاتھ پر تمام چیزیں قرینے سے جمانے کے بعد اُس نے قادر سے انگیٹھی بھروائی۔ اور خود آلو کی ورقیاں کرنے لگی۔ گلّے پر بیٹھے حاجی ساب بار بار جھک کر ان دونوں کو ایک نیا کام کرتے ہوئے دیکھتے اور مسکرا دیتے۔

اذان ہوتے ہی دکانیں ویران ہونی شروع ہو گئیں۔ تب سکینہ نے فخریہ انداز میں قادر کو دیکھا، پھر ایک پکوڑی اٹھاکر قادر کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی

"لو کھاؤ۔ بہت مزے دار ہے۔

"تو کھا۔ تو روزہ پکڑی تھی۔ میں کیا روزہ پکڑا

"تم یہ تو لو۔ میں بھی کھاتی

قادر نے پکوڑی لے کر منھ میں رکھ لی۔ تین چار مرتبہ منھ چلایا۔ پھر ہاتھ بڑھا کر دوسری پکوڑی اٹھائی۔ اسی طرح وہ کئی پکوڑیاں کھا گیا پانی کا ایک گلاس اور حاجی کے ہوٹل کی گرما گرم چائے پینے کے بعد وہ سکینہ سے مخاطب ہوا۔

"سچی رے۔ مزے دار ہے بھجیہ

"سچ

"ہاں رے۔ بہت مزے دار ہے۔

"اور بھی مزے دار لگے۔ اگر تم بھی روزہ پکڑو۔

"بس بس۔ تو چ پکڑ۔ اس کو۔ اپن کبھی یہ لفڑے میں نہیں گرا۔ کیا۔

"گر کے تو دیکھو۔ معلوم پڑے گا۔

"مالوم ہے اپن کو۔ بہت بھوکا رہیلا ہے۔ اپن۔ کیا

"صرف بھوکے رہے نا۔ پیاسے بھی رہو۔ اور پھر شام کو روزہ۔ چھوڑو۔ ایک بھجیہ کھاؤ۔ اور ایک گلاس ٹھنڈا پانی۔ تمہاری قسم۔ ایک دم الگ مزہ ہے

"ہوئیں گا۔ ہوئیں گا۔ اپن نہیں پکڑ سکتا۔ اور سن۔ اپن کو پکڑنے کا بھی نہیں۔

"مت پکڑو۔ مگر یاد رکھو۔ جماعت والے بولتے تھے کہ اچھے کام کرنے والے مردوں کو جنت ملتی ہے۔ حوریں ملتی ہیں اور برے کام کرنے والے جہنم کی آگ میں جلائے جاتے ہیں۔

قادر نے سکینہ کی بات غور سے سنی، اُس کی آنکھوں میں بے یقینی کے سائے ابھرے۔ اور ڈوب گئے۔ کافی دیر تک خاموشی رہی، پھر قادر نے سکینہ سے کہا

"یار یہ جماعت والے پھالکا تو نہیں مار رہے

"پھر الٹی سیدھی بات کئے تم۔

"یار تو بھڑک مت۔ دیکھ ابھی تو ہچ بولی میرے کو۔ اچھے کام کرنے والے کو جنت ملتی۔ حوریں ملتی ہیں۔ بولی نا؟

"ہاں بولی۔ وہ لوگ میرے کو بولے۔ میں تم کو بولی

"اچھا کری۔ پن ابھی تو سن۔ وہ لوگ آئیں گے تو پوچھنا۔ اچھے کام کرنے والے مردوں کو حوریں ملیں گی اور عورتوں کو — تو سمجھ رہی کہ نہیں۔ وہ لوگ کو پوچھ

"پوچھوں گی۔ ضرور پوچھوں گی۔ آنے دو۔ ان کو

تمام سامان سمیٹ کر حاجی صاحب کے ہوٹل میں ایک طرف رکھنے کے بعد وہ دونوں گھر پہنچے تھے۔ منہ ہاتھ دھوکر، سکینہ نے وضو کیا۔ اور نماز پڑھنے لگی۔ اُدھر قادر پیسے گن رہا تھا۔ اِدھر نماز پڑھتے ہوئے قادر کا سوال سکینہ کے ذہن میں بار بار ابھر رہا تھا۔ سر ہلا ہلا کر وہ اس خیال سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کرتی۔ خدا خدا کر کے اُس نے نماز ختم کی اور قادر کی طرف دیکھا تو وہ بولا

"ایک کتا کم ہے

"کیسے

"تو گن لے

"تم گنو یا میں۔ ایک ہی بات ہے۔ میں پوچھی کم کیسے؟ فائدہ ہونا چاہیئے

"وہ تو سوچ۔ میں یہ ٹائم خالی نقصان کی سوچ رہا ہوں۔ پورا ایک کتا کم ہے۔ کیا

سکینہ نے جائنماز تہہ کی۔ اور اس کے ساتھ ہی پہلے روزہ کی دن بھر کی مصروفیت بھی تہہ کر دی۔ جائنماز کو صندوق پر رکھتے ہوئے وہ مسکرا کر قادر سے بولی

"نیک کام میں نقصان ہو ہی نہیں سکتا۔ سنے کیا۔ یہ دیکھو۔ یہ اتی پکوڑیاں بچی ہیں۔ ہے نا۔ پھر تم اپنے دوستوں کو بھی پوڑی باندھ باندھ کر دیئے۔ پھوکٹ میں دیئے کہ نہیں۔

"ہاں دیا۔

"تو اب حساب لگاؤ

"بروبر بولی تو۔ پن۔ تو بھی فائدہ کیا ہوا۔

"فائدہ۔ کیا بول رہے تم۔ اے ثواب ملے گا اپن کو۔ سب دھندے والوں سے زیادہ دیئے ہم روزہ داروں کو

"ہوں۔

قادر کی لمبی سی ہنکاری میں بھی چالیس فیصد بے اطمینانی شامل تھی۔

دوسرے روز مغرب بعد جب وہ دونوں گھر پہنچے اور قادر نے پچھلے دن کی مانند حساب لگایا۔ تب بھی دس روپے کم نکلے۔ اُس روز بھی سکینہ نے ایک زائد پکوڑی فروخت کرنے کی دلیل سے قادر کو قائل کیا۔ تیسرے روز خسارہ بارہ روپے کا ہوا تھا۔ قادر نے منہ بنایا تو سکینہ نے انتہائی ٹھہرے ہوئے لہجے میں حاصل ہونے والے ثواب کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے خسارے کا احساس زائل کر دیا۔ اُس سے اگلے روز سکینہ نے پکوڑیوں کا حجم کس قدر کم کر دیا تو خسارہ پانچ روپے کا ہوا۔ گھر پہنچ کر قادر نے صرف اسے کنکھیوں سے دیکھا تھا۔ سکینہ نے پھر ثواب کی اہمیت جتائی۔ قادر نے اُس کی باتیں غور سے سُنی تھیں۔ پھر ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے اُس سے بولا تھا

"میری انگلیاں بے چین رہتی ہیں۔ سمجھی کیا۔

سکینہ نے غور سے قادر کو دیکھا۔ کچھ سوچا اور گمبھیر لہجے میں بولی

"خالی بیٹھ کر پوڑھی باندھنے کی عادت ڈالو۔ اور ایک بات اچھی طرح سمجھ لو۔ میں تم کو رمضان میں مزدوری کرنے نہیں دوں گی۔ کیا

آخری لفظ۔ اُس نے قادر کے انداز میں لہجہ میں کھنک پیدا کرتے ہوئے ادا کیا تھا۔ اور اُس کے

اُس انداز پر قادر صرف مسکرا کر رہ گیا تھا۔

رمضان کا مہینہ، سحر و افطار کے ہنگاموں کے درمیان اپنا نصف سے زائد سفر طے کر چکا تھا۔ قادر اور سکینہ پکوڑیاں بنا بنا کر فروخت کر دیتے تھے۔ ثواب کمانے کی خوشی میں سکینہ دل جمعی سے پکوڑیاں بناتی، مغرب کے وقت قادر کی آواز میں آواز ملا کر انہیں فروخت کرتی۔ مغرب بعد قادر دن بدن اپنی رقم میں کمی کا حساب لگا کر خاموش ہو جاتا۔ سکینہ کی زبانی ثواب کی مسلسل تلقین نے اس کے ذہن سے نقصان کا احساس تقریباً ختم سا کر دیا تھا۔

اکیسویں روز قادر بیٹھا پیاز کاٹ رہا تھا اور سکینہ بیسن پتلا کر رہی تھی۔ تب حاجی کی ہوٹل والے حاجی صاحب ان کے پاس پہنچے۔ ہاتھوں میں مسواک تھامے۔ چہرے پر مخصوص مسکراہٹ جمائے ہوئے۔ علیک سلیک کے بعد انہوں نے معنی خیز انداز میں قادر سے پوچھا

"کیوں قادر بھائی۔ کتنی مُوڑی۔ گھُس گئی؟

میاں بیوی۔ دونوں نے ایک ساتھ حاجی صاحب کو دیکھا۔ پھر ایک دوسرے کو۔ پل بھر کی خاطر دونوں کی آنکھوں میں عدم اعتماد کے سائے لرز کر رہ گئے۔ پھر قادر نے حاجی صاحب سے پوچھا

"تم کو کیسے مالوم

"کیوں

"کتنی مُوڑی گھسی۔ یہ راز۔ میرے کو مالوم یا میری گھر والی کو

"لیکن مجھے تو پہلے دن سے معلوم ہے۔

"کیا۔ سکینہ اور قادر ایک ساتھ چونکے تھے۔

"ہاں۔ مجھے تو پہلے روز ہی سے معلوم تھا کہ تم لوگ گھاٹے میں رہو گے

"پن کیسے۔ ؟ اور معلوم تھا تو بتائے کیوں نہیں حاجی صاحب ؟

سکینہ نے معصومیت سے پوچھا۔ حاجی صاحب نے مسکراتے ہوئے سکینہ کو دیکھا۔ پھر ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولے

"ارے احمقو! تم پہلے روز سے ہی مہنگا اور اچھا تیل استعمال کر رہے ہو۔ اور تمہاری رقم تیل میں جا رہی ہے۔

"بولے تو ؟ قادر کے پوچھنے پر حاجی صاحب اُس سے بولے

"ارے بدھو۔ بھجیہ کے لئے چالو تیل واپرتے ہیں

"چا ..... لو ..... چالو تیل ...... تو ..... تو کیا تم بھی ....

جواب میں حاجی صاحب نے اثبات میں گردن ہلائی۔ قادر نے سر جھکا لیا۔ اُس کی آنکھوں میں سینکڑوں چہرے گھوم رہے تھے۔ نڈھال، خشک ہونٹوں والے چہرے، بھوک اور پیاس جن کے ہونٹوں پہ آن رکی تھی۔ حاجی صاحب کچھ کہہ رہے تھے، لیکن وہ تو ذہنی طور پر کہیں اور ہی تھا، البتہ اُس کے ہاتھ تیزی سے پیاز کاٹ رہے تھے۔ اور اُس کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔ سکینہ نے کھولتے ہوئے تیل میں ایک پکوڑی ڈالی تو تیل میں چھوٹے چھوٹے کئی بلبلے پیدا ہونے لگے۔ قادر نے ایک لمحہ کے لئے انہیں دیکھا۔ اور اُسے لگا کہ ہر بلبلے میں ایک روزہ دار موجود ہے۔ سکینہ غور سے اُس کی آنکھوں سے بہتے آنسوؤں کو دیکھ کر سوچ رہی تھی کہ یہ آنسو۔ پیاز کی جلن کے باعث بہہ نکلے یا ——— • ———— ○

• گز ——— سو روپے (جیب تراشوں کی اصطلاح)
• گُتّا ——— دس کا نوٹ "
• موڑی ——— رقم

ننھی

"کبوتر ..... کبوتر .... کبوتر .... کبو .....

پانی سے بھری بالٹی اٹھانے کے بعد وہ جوں ہی پلٹی تو اُس کی آواز حلق میں رک گئی۔ دل کے کسی گوشے سے خوشی کا سوتا پھوٹا اور دوسرے ہی پل اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ دالان میں ہمیں موجود پاکر اس نے بالٹی چھوڑ دی، ایک چھناکہ ہوا، بالٹی میں سے تھوڑا سا پانی اچھل کر زمین پر گرا۔ اس نے دھپ دھپاتے ہوئے زینے طے کئے اور آپا کہہ کر میری بیوی سے لپٹ گئی۔ کوئی ایک منٹ تک وہ بیگم سے لپٹی کھڑی رہی پھر ان کے ابھرے ہوئے پیٹ کو محسوس کرتے ہی اس کی خوشیوں میں کچھ اور اضافہ ہوگیا الگ ہوتے ہوئے اس نے کنکھیوں سے میری طرف دیکھا اور بیگم سے بولی

"اری ..... تم نے تو بڑی جلدی مچادی .... کہیں بھاگا جادے تھا یو بچّہ

میں مسکراتے ہوئے باورچی خانے کی طرف بڑھ گیا۔ ساس چولہے کے برابر بیٹھی پراٹھے بنا رہی تھیں۔ چولہے میں اُپلوں کے ساتھ کتے بھی جل رہے تھے۔ اُدھر دالان میں وہ بیگم سے مخاطب تھی

"سہر گئی ہو بیاہ کر ..... پر مجھے تو لگے دماگ اِنگے چھوڑ گئیں

"کیوں کیا ہوا ؟

"اے لو .... اری آپا .... بیاہ کو دن ہی کئے گزرے جو تم بوجھ ٹھائے لوٹ آئیں

"چپ رہ کم بخت

"اور لو ..... اب چپ بھی مجھے ہی کراؤ ہو .... بھائی جی کو کرواتیں چپ ..... سچ کہوں ہوں۔ ابھی تو تمارے مجے کے دن تھے۔ میں تو جانوں دو چار سال مجے کرتیں۔ پھر گو' موت سے ہاتھ سَنتے تو کوئی بات بھی تھی۔

"کون ہے یہ ؟ — چائے کی پیالی ساس سے لیتے ہوئے میں نے پوچھا تو پراٹھا پلٹتے ہوئے

ساس نے جواب دیا۔

" ننھی۔ کونجیڑی ہے۔ ڈیوڑھی میں پڑی رہتی ہے۔ اس کی ساس کسی زمانے میں ہمارے گھر کام کیا کرے تھی

" مر گئی وہ

" نہیں ۔ رام راج میں خربوزوں کی پالیز لے رکھی ہے ۔ اور اسے میرے سپرد کر گئی ہے ۔

" کیوں

" وہاں اس کا پہلا میاں جو ہوگا

" پہلا میاں

میں نے حیرت سے ساس کی طرف دیکھا ۔ وہ جھینپے ہوئے انداز میں نظریں چراتے ہوئے آٹے کی پرات میں سے نیا پیڑا توڑ رہی تھیں ۔ قدرے توقف کے بعد پیڑا بناتے ہوئے انہوں نے کہا

" ہاں ۔ اس سے طلاق لینے کے بعد، اس کے بڑے بھائی سے نکاح کیا ہے جھولو پیٹی نے ۔

" اوہ ۔ میں نے ہونٹ سکوڑنے کے بعد چائے کا گھونٹ لیا

" یہ کبوتر، کبوتر کیا بک رہی تھی ؟ ۔۔۔ بیگم کی آواز سنائی دی ۔

" اجی وہ ..... کچھ نا ۔ رات پھلم دیکھنے گئی تھی ملا کے سنگ ۔ اڈے کے دھورے منڈوا بنا ..... اسی میں گا دے تھی وہ کسری ... کبھی کولہے ٹھاوے تھی اور جیکھے تھی کبوتر، کبوتر ۔ اور ...... اور کبھی اپنے کبوتر دکھاوے تھی ۔

" ننھی ۔ تو چپ نا رہنے کی ۔۔۔ ساس نے توے پر پراٹھا ڈالتے ہوئے بلند آواز میں اسے ڈانٹا تو وہ دھپ سے چبوترے پر اتر آئی اور جھک کر ساس سے بولی

" میں کیا کہہ رہی حکیمنی ۔ آپا بوجھیں ہیں گی ۔ میں تو یو بتاؤں تھی کہ رات پھلم دیکھی تھی اسی میں گا دے تھی وہ کسری ..... ایمان سے لے .... مجھ دکھیاری کو تو سب کیہویں ..... آنکھ کا پانی جاتا رہا ۔ اسے کسی نے بھی نہ کہا .... کبھی تنے تھی ۔ کبھی جھکے تھی اور اللہ کسم حکیمنی ۔ ایک بات مانو ۔ جاؤ دیکھ یاؤ منڈوے میں کسری کو

" چپ رہ کم بخت ۔ کسی کو تو خیال کیا کر ۔ آتے کی شرم نہ جاتے کا خیال

ساس نے دست پناہ اٹھایا تو وہ اک دم سے پیچھے ہٹ کر کھل کھلائی اور ہنستے ہوئے بولی

" تم بھی کیا کہو حکیمنی ۔ یو کوئی گیر ہیں ۔ آپا کے میاں ہیں گے ۔ گھر کے داماد ۔ کیوں جی بھائی جی

"اری کہاں جا مری ۔ میں اِنگے بیٹھا پانی کی باٹ دیکھ ریا ہوں
ڈیوڑھی میں سے ننھی کے میاں کی آواز آئی ۔ ننھی نے اک ذرا سا منھ ترچھا کیا اور دالان کی طرف بڑھتے ہوئے اسے جواب دیا ۔
"بالٹی بھری رکھی نل کے دھورے ۔ آکے ٹھالو جی ۔ میں آپا کنے بیٹھی

چکّی سے اٹھنے کے بعد بھی ذہن پر چکّی کی گھرگھراہٹ مسلط تھی ۔ اور کانوں میں چکّی کے مالک لالہ کیشو داس کی آواز قید سی ہو کر رہ گئی تھی ۔ لالہ بڑا نیک بندہ ہے کتنے پیار سے اس نے استقبال کیا ۔ خود ہی چائے اور پاپے لایا تھا ۔ پاس پڑوس کے دکان دار متحیرانہ انداز میں ہمیں دیکھ رہے تھے ۔ لالہ کے کسی ہم عمر پڑوسی نے اپنی حیرت ظاہر کی تو اس نے دھیمے انداز میں مسکراتے ہوئے کہا تھا ۔
"اپنے حسد کے بہنوئی ہیں ۔ بمبئی میں رہویں .... اور تم تو جانو ہو ۔ یہ سب کچھ حسد کا ہے گا
"کیا تنخواہ دیتے ہیں آپ بھائی اسد کو ؟ ــــ میں نے ایک احمقانہ سوال کیا تو لالہ مسکرائے تھے ۔ اور اسی دھیمے لہجے میں بولے تھے ۔
"تنخواہ ــــ اور میں دے سکوں ..... وہ بھی میاں حسد کو .... میاں یو مالک ہے گا ۔ چکی اس کی ہے گی ۔ جو جی میں آوے ۔ گلّے میں سے ٹھالے ہے ۔
لالہ کا جواب سن کر میں نے بھائی اسد کی طرف سوالیہ انداز میں دیکھا تھا ۔ انہوں نے تائیدی انداز میں مسکراتے ہوئے سر ہلایا تھا ۔ پھر جب چکی کے پاٹوں نے گھرگھرانا شروع کیا تب فوراً ہی ایک ہاڑا اٹھا کر انہوں نے چکی کے پھول میں پلٹ دیا ۔ اُدھر لالہ اپنے مخصوص انداز میں کہہ رہے تھے ۔
"میاں مشرف اور میاں اعجاز پاکستان نا جاتے تو حسد کو یہ دن نہ دیکھنے پڑتے ۔ وے تو انگے چل دئے ۔ اور یہ اِنگے ڈائیں ڈائیں پھرا کرے تھا ۔ کبھی اپنے ماموں کے سنگ ، کبھی کیتھوڑے والے میاں کیسر کے ۔ کئی برس تو یوں ہی کھوئے اس نے ..... ماموں نے کچھ سکھایا نہ میاں کیسر نے ۔ اور کون سکھاوے ہے ۔ سب سورے جوتیاں سیدھی کرادیں پانی بھروائیں ۔ ہاں تو ۔ میں کہوں تھا ۔ برا ہو سیاست کا ۔ ملک تو بٹا ہی بٹا ۔ کم بختی مارے دل بھی بٹ گئے ۔ جو سورے ۔ چوراہے پر گچھا ڈالے حجامت بنایا کریں تھے اک دم سے خان صاحب ہو گئے ۔ آفت تو یہ صاحبوں کی آئی ۔ کام دھندا ۔ میاؤں نے کبھی نہ کیا ۔ کھیتی باڑی ۔ بٹائی پہ ٹھا دیا کریں تھے ۔ بعد کو ٹھانے کو کچھ نہ بچا ۔ اب جھوٹوں کی زندگی جیوے ہیں .....

کیسی کیسی کہانیاں بکھری پڑی ہیں اس طرف ۔ ایک سے ایک دل خراش ، چپ چپ سی ۔ کسی سے شکوہ نہ شکایت ۔ یہ اسد ۔ بیگم کا بھائی ۔ اسے اپنے ان بھائیوں سے کوئی شکایت نہیں جو بٹوارے کے بعد پاکستان چلے گئے ۔ اور اسے بھول گئے ۔ اسے ہی کیا ۔ انہوں نے تو اپنی ماں کو بھی فراموش کر دیا ۔

چلتے چلتے کمر اور سینے پر پسینے کی نمی محسوس ہوئی تب چونک کر میں نے دائیں بائیں دیکھا ۔ مکٹ لال کی دکان قریب ہی تھی ۔ یعنی گھر آچکا تھا ۔ مکٹ سے سگریٹ خریدنے کے بعد میں گھر کی طرف چل دیا ۔ دور سے مکان دکھائی دیا ۔ بے اختیار لالہ کیشوداس کی آواز کانوں میں گونجی۔ دروازے کے دونوں پاٹ بیٹوں کا انتظار کرتی ماں کی آنکھوں کی طرح کھلے ہوئے تھے ۔ اور اندر سے ننھی کی آواز آرہی تھی ۔ میرے کھکارنے پر چوکی سے اٹھنے کے بعد اس نے لوٹا اٹھایا اور دھپ دھپ کرتی نل کی ہودی پہ پہنچی ، ہتھی چلائی ۔ لوٹا بھرنے کے بعد تیزی سے لہراتی ہوئی وہ بیچ کے در میں آکھڑی ہوئی ۔

" لوٹا رکھ دو ۔ میں ہاتھ دھولوں گا

" میں دھلاؤں

" ارے بھئی ، اب تو ہم پرانے ہو گئے ۔ یہ چونچلے ختم کرو

" اے لو ۔ اور سنو ..... داماد اس وکھت تک پرانا نہ ہوا کرے جب لونیا نہ آجا۔ بس ۔ آجاؤ

ننھی کی بات میں وزن تھا ۔ خاموشی سے آگے بڑھکر ، منھ ہاتھ دھونے کے بعد میں نے لباس تبدیل کیا تب تک چوکی پر دسترخوان بچھایا جا چکا تھا ۔ بیگم کھانا اتار رہی تھیں میں نے ایک طرف بیٹھتے ہوئے بیگم سے ساس کے بارے میں پوچھا تو پتہ چلا کہ وہ قریبی گاؤں کسی کے تیجے میں گئی ہوئی ہیں۔ ان کی غیر موجودگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نے بیگم سے ساتھ کھانے پر اصرار کیا مگر وہ پس و پیش میں مبتلا تھیں مبادا کھانے کے دوران اماں چلی آئیں ۔ ننھی نے انہیں غور سے دیکھا اور بولی

" اب لے وہ نہ آنے کی ہیں ۔ لاؤ ۔ پنکھا مجھے دو اور بیٹھ جاؤ ۔ اری .... سرماؤ ہو ۔ باولی ہوئی ہو ..... دیکھیو تو کتنے اچھے ہیں گی بھابھی جی ۔ سنگ کھلاویں گے ..... اور مازا ایک تلا ہے گا۔ جھولو بیٹیا ۔ بھول کے بھی نہ پوچھے ہے گا ۔

" آج ۔ تم بھی ہمارے ساتھ کھانا کھاؤ ۔ میں نے مسکراتے ہوئے اسے مدعو کیا تو وہ

پھول کی طرح کھل اٹھی۔ پھر ممنونیت آمیز لہجے میں بولی

"اُنگے بھی تھارا ہی ہے گا بھائی جی

"اگر اُنگے ہمارا ہے تو اِنگے تمہارا ہوا۔ کیوں۔ ٹھیک ہے نا؟ ۔ چلو آجاؤ ۔ میں نے اسی کے لہجے کی نقل اتاری تو بیگم بھی مسکراتے ہوئے مصر ہوگئیں۔ ننھی نے ایک بار تو پہلو بدلا پھر چوکی کا کونا سنبھالتی ہوئی بولی

"جِد کرو ہو تو روٹی پہ سالن دھر مجھے پکڑا دو ۔ اُرے بیٹھ کے کھالوں گی

"نہیں ۔ ہمارے ساتھ بیٹھو، اپنی آپا کے برابر ۔ میری ہدایت پر وہ بیگم کے برابر بیٹھ تو گئی لیکن اس کے پیر چوکی سے نیچے ہی تھے۔ میں نے اسے مخاطب کیا۔

"بھئی تم ہو تو ہماری سالی ۔ پر شرما رہی ہو۔ پیر اوپر کرو ۔ تمیز سے بیٹھو ۔ دسترخوان کے کچھ آداب ہوا کرتے ہیں ۔

"اجی ہوا تو کریں ۔ پر مجھے کچھ نہ بتایا باولے چوروں نے

"ہائیں ۔ تم گالیاں بھی بک لیتی ہو ۔ میں نے چونکتے ہوئے اسے ٹوکا تو وہ جھینپ گئی ۔ پھر سر جھکانے کے بعد اس نے مجھ سے پوچھا

"یو گالی ہے گی؟

"پھر کیا ہے؟

"اجی ناپھ کرنا بھائی جی ۔ ماری برادری میں تو ..... اس کی سمجھ ہی میں نہ آیا کہ اپنی صفائی کس طرح پیش کرے۔ میں نے کچھ سوچ کر بات بدلنے کی خاطر کہا

"مجھے تم سے کچھ باتیں بھی کرنی ہیں

کچھ ڈرتے، سہمتے اور لجاتے ہوئے اس نے روٹی کی طرف ہاتھ بڑھایا

"اچھا ..... یہ بتاؤ .... تم نے اپنے میاں سے طلاق کیوں لی تھی؟

میرا سوال سن کر اس نے پہلے تو بیگم کو دزدیدہ نگاہوں سے دیکھا پھر اک نظر مجھ پہ ڈالی، کچھ سوچا اور پٹاخ سے بولی

"وہ سورا ۔ اِنگے منھ ڈال پڑ جایا کرے تھا ۔

اس نے اپنی بھری بھری چھاتیوں کی طرف اشارہ کیا۔ میں اور بیگم دونوں ہی جھینپ کر رہ گئے۔ کچھ دیر تک ہم سب ہی خاموش رہے ۔ پھر میں نے ہی بات چلانے کی غرض سے پوچھا

"بس۔ اتنی سی بات پر؟
"اجی یوہی ہوتی تب تو بات بن جاتی۔ سورے کو لے آتی سڑک پر۔ پردہ تو نولائی گئے جاتھا۔ بتیرا کہا بھڑوے سے
"پھر گالی
"اجی ماپھ کرو۔ گلتی ہوگئی۔ عادت جو ہے گی سسری۔ ہاں تو میں کیا کہوں تھی ...... ہاں یاد آگیا۔ بتیرا کہا بھاڑوے سے۔ نولائی کرنے کو جی کرے تو ما کے سنگ جنگل چلا جا۔ پر مان کے ہی نہ دیا۔ کب تک نولاتی اپنے کو؟ سال بھر بعد پنچوں کے آگے کہنا ہی پڑگیا۔
"تو سال بھر نولایا اس نے؟
ہاتھ روک کر نھی نے مصنوعی غصے سے پہلے میری طرف دیکھا پھر بیگم سے شکایت بھرے انداز میں بولی
"دیکھو ہو آپا سیمیم۔ یہ تو مجے لے رہیں
"بہنوئی جو ہوں تمہارا
"ایمان سے لے۔ میں تو ایسا نہ سمجھوں تھی
نھی نے جھینپی ہوئی آواز میں کہا اور سر جھکانے کے بعد پانی کے گلاس کی طرف ہاتھ بڑھادیا

بچّی کی پیدائش کے بعد میری واپسی کا پروگرام بنا تو بیگم کا منھ اتر گیا۔ ساس اور سالے کے چہروں پر بھی افسردگی چھائی لیکن میری مجبوریوں کے پیش نظر سب ہی چپ رہے۔ بیوی کو اخراجات کی خاطر معقول رقم اور ڈھیروں دلاسے دینے کے بعد اٹیچی اٹھانے ڈیوڑھی میں پہنچا تو وہاں نھی اور اس کا میاں موجود تھے۔ نھی کی ہدایت پر اس کے میاں نے رکشہ نکالا اور مجھے بس اڈے تک چھوڑ آیا۔
میرانپور سے میرٹھ، اور بمبئی تک کا سفر تصورات کے سہارے طے ہوا۔ بمبئی پہنچ کر کاروبار کے چکرویو میں کچھ اس طرح الجھا کہ میرانپور یاد آیا نہ وہاں کے نواسی۔ تین ایک ماہ بعد بیگم بھائی اسد کے ساتھ بمبئی چلی آئیں۔ میرے روز و شب مکان سے دکان۔ اور دکان سے مکان کی روٹین کی نذر ہونے لگے۔ دو ڈھائی سال کا عرصہ اسی آمد و رفت یا پھر بیٹیا کے ساتھ کھیلنے کھلانے میں گزر گیا۔ اسی دوران بیگم پھر دوہری ہونے لگیں۔ قبل از وقت ہم ایک مرتبہ پھر میراں پور پہنچے۔ ڈیوڑھی خالی پڑی ہوئی تھی۔ صحن میں ساس اپنی بیٹی سے لپٹ گئیں۔

بھائی اسد نے بچی کو مجھ سے لے لیا۔ چائے وغیرہ سے نچیت ہونے کے بعد میں نے ننھی کے بارے میں بھائی اسد سے پوچھا تو وہ برا سا منھ بنا کر رہ گئے۔ میں نے جب اس کا سبب معلوم کیا تو ناگواری سے بولے

"کیا رکھا فضول باتوں میں

"آخر ہوا کیا؟

"ہونا کیا۔ بھاگ گئی حرام زادی

"کس کے ساتھ؟

"اپنے یار کے ساتھ بھاگی ہوگی

"پر کیوں

"بس یوں ہی سی تھی وہ۔۔ ایک کے پاس پڑے تھی۔ دوسرے سے نین مٹکے چلیں تھے سری کے۔ موٹے سے بیاہی تھی تو ملا کو گھورا کرے تھی۔ ملا کے نکاح میں آئی تو .....

"اسد جا۔ گوشت لیا۔ جہاں دیدہ ساس نے بات کاٹ دی، بیٹے نے ماں کی طرف معنی خیز انداز میں دیکھا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

دوسرے روز سہ پہر کے وقت چائے پینے کے دوران ملا آگیا۔ ساس نے ننھی کے بارے میں معلوم کیا تو وہ گالیاں بکنے لگا۔ مغلظات کا طوفان تھا کہ تھمنے کا نام ہی نہ لے رہا تھا۔ ساس الگ خفیف ہو رہی تھیں کہ کہاں میں نے ریڈیو کھول دیا۔ میری موجودگی ان کی ندامت میں اضافہ کر رہی تھی ادھر ملا ننھی کی ماں بہنوں کو اپنے بستر پر پہنچا رہا تھا دم لینے کی خاطر ایک پل کو وہ چپ ہوا تب میں نے اسے ڈانٹا۔ پہلے تو چند لمحے وہ حیرت سے مجھے دیکھتا رہا پھر بھرائی ہوئی آواز میں بولا

"وسے جانا تھا۔ چلی جاتی۔ پر اپنے پوت کو کیوں چھوڑ گئی۔ ماری تو جان اجاب میں ہے گی۔ ماں سے کہوں ہوں کہ اسے سنبھال تو وہ گالیاں دیوے۔ بہنوں کے آگے ہاتھ جوڑوں تو وہ کہویں اسی چھنال کے دھورے چھوڑیا

"تو چھوڑ آ

"ابھی کہاں چھوڑ آؤں۔ کچھ پتہ بھی ہو حرام کا۔ میں تو نہ جانوں کہاں چھنالہ کر رہی

"اچھا بس۔ چپ رہو تم ـــــ میں اس کی گالیوں سے عاجز آچکا تھا وہ کافی دیر تک منھ کھولے مجھے دیکھتا رہا۔ غالباً اسے یقین تھا کہ اس مسئلہ پر میری ہمدردیاں اسی کے حصے میں آئیں گی۔ لیکن میری

گھڑکی نے تو پانسہ ہی پلٹ دیا تھا۔

"آپ نے بھی مجھ ہی کو ڈانٹا۔ اسے کچھ نہ کہا۔ جو اپنی کوکھ کے جنے کو چھوڑ گئی۔ ہائے ..... مارا تو نصیب ہی کھوٹا ہے گا سورا۔

ہارے ہوئے انداز میں رک رک کر اُس نے کہا اور سر جھکا کر کھڑونجے کی اینٹوں کو دیکھنے لگا۔ ہم سب ہی خاموش تھے۔ اور اپنے دِلوں میں مختلف احساسات کو جگہ دے رہے تھے۔ کچھ لمحے اسی عالم میں گزرے پھر اس خاموشی کو بیگم نے توڑا۔ وہ ملاّ کی حمایت میں بول رہی تھیں۔ میں نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا تو وہ مجھ سے کہنے لگیں۔

"کسی کا تو آوا خراب ہوتا ہے۔ اس کا تو کھدانا ہی خراب ہے

دن چھپنے سے اک ذرا دیر پہلے ہم زلف اور ان کے بال بچے بھی آگئے۔ رات کے کھانے تک گھر بھر میں خوب چہل پہل رہی۔ سالی کی بچیاں کبھی مصالحہ پیسنے میں لگی رہیں۔ کبھی اُپلے توڑنے میں۔ ہم زلف ہمیشہ کی طرح اس بار بھی مجھ سے شکایت کر رہے تھے کہ میں ان کے لیے بمبئی سے پاپلیٹ مچھلی نہیں لایا۔ اُدھر نل کی ہتھی کی چوں چوں اس ساری بھاگ دوڑ اور گفتگو میں پس منظر موسیقی کا رول نبھا رہی تھی۔ تقریباً آٹھ سوا آٹھ بجے دسترخوان کے گرد بیٹھ چکے تو ہم زلف نے منھی کے بارے میں دریافت کیا بھائی اسد نے منھ بناتے ہوئے پھر ایک بار ننھی کو صلواتیں سنانی شروع کیں۔ میں نے ہاتھ روکتے ہوئے ان سے پوچھا

"وہ اتنی ہی میری تھی تو اپنے گھر میں کیوں جگہ دے رکھی تھی؟

"یہاں تو دنیا بھر کے لختیڑوں کو پناہ مل جاوے ہے

"کیوں

"اکیلے جو ہیں گے! ہمارے پرکھے یہ حویلیاں چھوڑ گیے ہیں گے۔ ایک آدھے کو دوسرا تھ کے لیے ڈالنا ہی پڑے ہے۔ ورنہ ان دیواروں سے ہی ڈر لگے ہے۔

"میرے خیال میں ساری غلطی ننھی کی نہیں۔ اس کے سسرال والے بھی ذمہ دار ہوں گے۔ میں نے اپنی رائے ظاہر کی تو بیگم نے فیصلہ کن انداز میں جواب دیا

"میں نے کہا تھا نا۔ اس کا کھدانا ہی خراب ہے

"یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ میری آواز بھی قدرے اونچی ہوگئی

"میاں چھوٹی سی تھی۔ تب ہی بگڑ چکی تھی ــــ ہم زلف نے قدرے جھکتے ہوئے آہستگی سے میرے کانوں میں کہا تو منہ کی طرف بڑھتا ہوا ہاتھ روک کر میں نے ان کی طرف دیکھا اور پہلو بدل کر رہ گیا۔ بھائی اسد نے غور سے میری طرف دیکھا پھر ایک ایک لفظ پر زور دے کر مجھ سے بولے

"بیکار سوچو ہو اُن کے بارے میں۔ کمین لوگ ہیں یہ

بھائی اسد کا ریمارک سن کر میں نے نوالہ پلیٹ میں چھوڑ دیا۔ فوراً ہی سب میری طرف متوجہ ہو گئے پھر انہوں نے ایکدوسرے کو یوں دیکھا جیسے کوئی تو میری اس حرکت کا مطلب جانتا ہوگا۔ اسی دوران پانی کا گلاس ختم کرنے کے بعد میں اٹھ کر کمرے میں گھس گیا۔ سالے کے ریمارک نے میرا موڈ خراب کر دیا تھا۔ کمرے میں بستر پر لیٹنے کے بعد میں نے سگریٹ جلایا اور لمبے لمبے کش لیتے ہوئے سوچنے لگا کہ شمالی ہند کے نجیب الطرفین آج بھی صرف اپنے زیورات کو کھرا سمجھتے ہیں۔ اُدھر باہر، دالان میں دسترخوان پر بیٹھی بیگم اپنے بھائی کو میری ناراضگی کی اطلاع دے رہی تھیں اور وہ بڑی معصومیت سے اس کا سبب دریافت کر رہے تھے۔

پہلی بچّی کی پیدائش کے موقع پر زیادہ نہ رکنے کی بہ نسبت اس مرتبہ مجھے کچھ زیادہ ہی ٹھہرنا پڑا۔ کیوں کہ میرے اپنے گھر کا شیرازہ بکھرنا شروع ہو گیا تھا۔ چونکہ میں اس جھمیلے میں ملوث ہونا نہیں چاہتا تھا لہٰذا بمبئی سے چلتے وقت ہی یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ اب لوٹ کر اپنوں میں نہیں جاؤں گا۔ بلکہ دہلی میں ہی کہیں ملازمت کروں گا۔ دبی دبی زبان سے بیگم نے میری خانگی معاملات سے اپنے گھر والوں کو آگاہ کر دیا تھا تاکہ ہمارے قیام کی بڑھتی ہوئی مدّت ان کے ذہنوں میں وسوسوں کو جنم نہ دے۔

اس بار بھی بیٹی پیدا ہوئی بیگم کا منہ اتر گیا۔ ساس کی آنکھوں میں بھی سراسیمگی کے سایے صاف دکھائی دینے لگے۔ بچّی کو غسل دے کر دائی نے میری طرف بڑھایا تو میں نے مسکراتے ہوئے اُسے ہاتھوں پہ اٹھا کر خدا کا شکر ادا کیا۔ ساس کی آنکھوں میں دوڑتے بھاگتے سراسیمگی کے سائے رخصت ہوئے۔ بچی کے کانوں میں اذان دی اور اقامت کہہ کر میں نے اسے ساس کی طرف بڑھا دیا۔ اور دائی کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ اپنے دوپٹے کا آنچل دونوں ہاتھوں پہ پھیلائے میرے سامنے کھڑی تھی۔ میں نے سوالیہ انداز میں ساس کی طرف دیکھا۔ پہلی بچّی کے موقع پر یہ معاملات ساس نے نپٹائے تھے اور میں اس علاقے کے طور طریقوں سے ناواقف تھا اسی لئے بے اختیار میری نظریں ساس پر پڑی تھیں۔

"چکمنی کی طرف کیا دیکھو۔ اِنگے دھی کے ہونے پر ساڑھے تین اور پوت پہ گیارہ روپئی اور ایک جوڑا دیوے ہیں۔

دائی نے مجھے آگاہ کیا۔ میں نے دوبارہ ساس کو دیکھا وہ تائیدی انداز میں سر کو جنبش دے رہی تھیں۔ میں نے جیب میں سے روپے نکالے۔ اکیاون روپے گن کر دائی کے دوپٹے پہ رکھ دیئے۔ اس نے تشکر آمیز انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے آنچل سمیٹا۔ دور ہی سے میری بلائیں لیں اور اپنی کنپٹیوں سے اک ذرا اوپر ہاتھ لے جاکر انگلیاں چٹخانے کے بعد زچہ خانے کی طرف بڑھ گئی۔

نو، دس روز بعد بیگم پہلا چلہ نہا چکیں تب میں دہلی کے لیے روانہ ہوا۔ اپنے کام کا تجربہ تو تھا ہی۔ تھوڑی سی تگ و دو کے بعد لاجپت نگر کی پشپا مارکیٹ میں شیشے کی دکان پر کانچ کاٹنے کی نوکری مل گئی۔ ہفتہ عشرہ بعد قریب ہی ایک بستی میں رہائش کی خاطر ایک کوارٹر کا بندوبست بھی ہوگیا۔ ڈیڑھ ماہ بعد میرا پور جاکر میں بچوں کو لے آیا۔ زندگی پھر روزمرہ کے معمولات کی نذر ہونے لگی۔ نسیم، فہیم اور بیگم کے علاوہ میری زندگی میں کچھ تھا تو معمولات کا وہ سلسلہ جو ذمہ داری کا احساس پیدا ہوتے ہی شروع ہوا اور شاید دم آخر ختم ہو تو ہو۔

کبھی کبھی ایک دم سے میرا پور یاد آنے لگتا۔ ساس، سالی، ساڑھو اور بھیا اسد کے چہرے نگاہوں کے سامنے آتے۔ اکثر جب بچے سو جاتے تب میں سوچتا کہ مجھے اپنے باپ کی یاد کیوں نہیں آتی۔ چھوٹے، بڑے بھائی بہنوں کو فراموش کرنے میں کس طرح کامیاب ہوگیا؟ ہمارے اختلافات اس نوعیت کے تو ہرگز نہ تھے کہ تعلقات کی ڈور توڑ دی جائے لیکن ہمارے بیچ جس قسم کی سرد مہری قائم تھی وہ جلد یا بدیر اس کی شکستگی کا باعث بن سکتی تھی۔

ایک دن سودا سلف لینے کے بعد گوشت خریدنے کے ارادے سے نظام الدین گیا تو دکان پر مجھے ننھی مل گئی۔ ہم نے خوشگوار حیرت بھرے انداز میں ایکدوسرے کو دیکھا۔ خیریت معلوم کی۔ میں نے اپنا پتہ بتانے کے بعد گھر آنے کی دعوت دی تو وہ منہ بناتے ہوئے بولی

"مشکل ہے گا میرا آنا بھائی جی۔ یہ سورے مردوے بھی عجیب ہوا کریں۔ کھد تو حرام کے جنے اِنگے اُنگے جھانکتے پھریں جا۔ اور جو ہم نے کسی کو دیکھ لیا تو آفت کاڑیں

"ٹھیک کہہ رہی ہو۔ مگر ..... ایک بات تو بتاؤ۔ تم نے ملا کو کیوں چھوڑ دیا

"اجی کیا کروگے بوجھ کر۔ حرام کے پلّوں نے یہی کہا ہوگا۔ میں بھاگ یائی۔ یونہ بتایا ہوگا ناس گئوں نے کہ ہم نے کیا کیا

"چلو تم ہی بتا دو

"اُٹتے ناس گئے حرامی تھے سارے۔ اجی میرا بس ہی نہ چل کے دیا۔ ورنہ سوروں کی پھلاند میں لگ دھرتی میں

"اُفوہ۔ کچھ بتاؤگی بھی۔ یا گالیاں ہی بکتی رہو گی۔

"اجی۔۔ جب لو حکیمنی کے پڑے رہے۔ چوکھی بیتے تھے۔ بس۔ ایک ہی ٹنٹا تھا۔ وہ حرام کا جنا دیر سے آوے تھا جوا کھیل کھال کے۔ پھر جانے کیا ہوا۔ وہ اپنی ماں کے بہکائے میں آگیا۔ ہم اپنے گھر چلے گئے۔ پر بھائی جی۔ انگے جانا ہی گجب ہو گیا۔ ملا حرامی تو رات رات بھر جوا کھیلا کرے تھا۔ اندر موٹا اس پھکر میں تھا کہ مجھے پھر لولائے پر مصیبت تو تب آئی جب ملا کا چاچا سکور ایک رات میرے کنے آن پڑا۔ پہلے تو میں یو سمجھی۔ جانو ملا آگیا ہے گا اور موج مستی کر ریا۔ پر جب مجھے لگا کوئی اور ہے گا تو میں نے رُکا مچا دیا۔ بڈھا تو بھاگ لیا پر کم بختی ماری ساس نے ٹربونگ مچادی۔ مجھے آوارہ، بدماس، اناں، چھنال کہتی رہی۔ جانو ہو کیوں۔ بڈھے سکور کا کہنا جو نہ مانا بھلا کوئی بات بھی تھی۔ جوان جہان مسٹنڈے موٹے کو تو دھورے آنے نہ دیا میں نے۔ اس بڈھے کو بگل میں پڑا لیتی۔ میں پڑاؤں بھاڑو کو۔ اس سے تو میں جھاڑو بھی نہ دلوانے کی اپنے آنگن میں۔

"ہوں۔ کسی کا آوا خراب ہوتا ہے۔ ان کا کھدانا ہی خراب ہے۔ غیر ارادی طور پر ننھی کے متعلق بیگم کا تبصرہ میری زبان پر آگیا۔ ننھی نے چونک کر میری طرف دیکھا پھر آہستہ سے بولی

"ٹھیک ہی کہو ہو بھائی جی۔ بعد کو۔ میں نے برادری کے آگے بات رکھنی چاہی تھی۔ پر۔۔۔ جانے ہو۔ اس بڈھی ڈڈو نے کیا کہا؟ وہ حرام کی کہوے تھی۔ یو کیا کرنے جا رہی تو،..... گھر کی گھر میں رہنے دے۔ باہر نہ کال۔ یوہی بات مارے رستے داروں نے بھی کی۔ بس جی۔ وسی دن میں نے گھر نہ کالی پر اگلے دن کھد نکل یائی۔ یہاں ایک بھلا مانس ٹکرا گیا مجھ سے۔ پر سورا۔ سک کرے ہے مجھ پہ

"پر تم اپنے بچے کو کیوں چھوڑ آئیں

"میرا بچہ؟ اپنے گھر سے لائی تھی دسے؟ ملا کا تھا۔ وسی کے دھورے چھوڑ یائی۔ مجھے کیا پڑی تھی۔ دوسرے کی بلا اٹھائے پھرنے کی۔

پھر ایکدم سے وہ چونکی، جیسے اچانک ہی اسے کچھ یاد آگیا ہو۔ دوسرے ہی لمحے سلام کرنے کے بعد

مڑ گئی ۔ میں گوشت کی تھیلی لیے اس وقت تک اسی جگہ کھڑا رہا جب تک ننھی میری نگاہوں کی حدوں سے نکل نہ گئی گھر پہنچنے کے بعد میں نے بیگم کو ننھی سے ملاقات اور ہمارے درمیان ہوئی گفتگو کا خلاصہ سنایا تو وہ افسردہ سی ہو گئیں۔

پونے دو سال بعد ہم پھر ایکمرتبہ ممبئی میں تھے ۔ دہلی سے آنے کے بعد مجھ پہ کچھ ایسی برساتیں گزریں کہ مجھے خود اپنا بھی ہوش نہ رہا ۔ یاد رہا تو بس اتنا کہ روز کنواں کھودنا ہے اور اسی بیگار کے طفیل اشیائے خورد و نوش کا حصول ممکن ہے ۔ اس عرصہ میں دو تین مرتبہ میرانپور کے چکر بھی لگے لیکن ننھی اور اس کی داستان حافظہ کے کسی ایسے گوشے میں جا پڑی تھی جہاں خاصی تعداد میں نبولیوں صفت یادوں کا ڈھیر تھا ۔ اور ان حالات میں مجھ میں ہرگز اتنا یارانہ تھا کہ یادداشت کی چھڑی سے اس ڈھیر کو بکھیرنے کی حماقت کرتا ۔ برسوں بعد ایک بار پھر مجھے میرانپور جانا پڑ گیا ۔ بھیّا اسد نے ہمیں اطلاع دی کہ ان کے بڑے بھائی مشرف کا کراچی میں انتقال ہو گیا ہے اور ہم یہاں بھی ان کا چہلم کر رہے ہیں ۔ میں نے بیگم سے ساتھ چلنے پر اصرار کیا تو جوانی کی دہلیز پہ کھڑی بچیّوں کا حوالہ دے کر انہوں نے انکار کر دیا ۔ مجبوراً میں تنہا ہی میرانپور پہنچا ۔ چہلم کی مجلس اور مرنے والے کے کردہ و ناکردہ گناہوں کا بوجھ ہلکا کرنے کی غرض سے بھیّا اسد نے اپنی برادری کے پیٹ بھرے میر صاحبان کی ضیافت کی تھی ۔ میں خاموشی سے سارا تماشہ دیکھتا رہا اور تیسرے روز ان سے رخصت ہو کر دہلی پہنچا بیس روپوں کے عوض جنتا ایکسپریس میں مجھے اوپر کی برتھ مل گئی ۔ برتھ پر لیٹتے ہوئے غیر ارادی طور پر میں نے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی ۔ خاصی بھیڑ تھی ۔ سامنے نیچے کی برتھ پر کالے سوٹ اور سبز دوپٹے میں ایک عورت بیٹھی ہوئی تھی ۔ چہرہ گھونگھٹ کی اوٹ میں تھا ۔ اس کے برابر ہی ادھیڑ عمر کے دو تین مرد تھے ۔ اور ٹھیک اس کے سامنے والی برتھ پر ایک نوعمر لڑکی ایک لڑکے سے سٹی بیٹھی تھی ۔ ان کے دائیں بائیں بھی کچھ لوگ تھے ۔ مقررہ وقت پر ٹرین نے رینگنا شروع کیا ۔ میں نے کروٹ بدل کر سونے کا ارادہ کیا کیوں کہ بس کے تین چار گھنٹے کے سُونے مجھے تھکا دیا تھا ۔ ابھی سونے کی کوشش کر ہی رہا تھا کہ پلکوں کے کواڑ خود بخود کھل گئے ۔ وہ آواز ..... جانی پہچانی تھی .....

"یو ۔ تیرا کیا لگے ہے گا ؟

میں نے کروٹ بدل کر دیکھا ۔ کالے سوٹ اور سبز دوپٹے والی عورت نوجوان لڑکی سے مخاطب تھی اور اس لڑکی کی آنکھوں سے اضطراب جھانک رہا تھا ۔ وہ جو اس سے لگا بیٹھا تھا وہ بھی بدحواس تھا ۔

"ارے تو، کیا لگے اس کا؟

"میں اس سے شادی کرنے والا ہوں۔ لڑکے کے جواب پر سب ہی ان دونوں کی طرف متوجہ ہو گئے

"اور کہاں جا رہے تم دونوں

"بم ..... بئی ..... ہم ..... وہاں ..... لڑکا بوکھلانے لگا۔

"ہوں۔ تو لونڈیا کو بھگا لایا ہے۔ کیوں؟ ـــــ دونوں نے ایک دوسرے کو بے چارگی سے دیکھا اور سر جھکا لیا۔ لڑکی اپنا نچلا ہونٹ دانتوں میں دبائے بیٹھی تھی۔ کالے سوٹ والی نے پھر کہا

"ارے باؤلو! چُپ کا گڑ منھ میں ٹھونس کر نکلے ہو گھر سے۔ میں کہوں۔ اب بھی کچھ نہ بگڑا۔ اوکھلے پہ گاڑی تھمے گی۔ گھر لوٹ پڑو اور تو۔ کان کھول کر سن لے۔ لونڈیا عورت جات کی دو کھونٹیں ہوا کریں۔ ایک باوا کی۔ دوجے کھسم کی۔ میں تو دیکھتے ہی جان گئی کھسم والی نا ہے گی۔ سن بھی رہی یا نا؟ اری باؤلی۔ رستے وہی پکے ہوا کریں جو گھر کے بڑے کیا کریں۔ سمجھے ہے نا۔ میں کیا کہہ رہی۔

وہ دونوں سر جھکائے بار بار تھوک نگل رہے تھے۔ اور کمپارٹمنٹ میں بیٹھے دیگر افراد خاموشی سے صورت حال کا جائزہ لے رہے تھے۔

"کیا سوچو ہو تم دونوں۔ کہاں کے ہو؟ ـــ لڑکے نے پھنسی پھنسی آواز میں بتایا کہ دونوں ہی سہارنپور کے کسی نواحی علاقے کے ہیں۔

"میری مانو۔ سہارنپور لوٹ جاؤ۔ مجھ سوں۔ سڑی سودائی نے تمہیں دیکھتے ہی تاڑ لیا کہ کھونٹ تڑا کر بھاگے ہو تم دونوں۔ بمبئی پہنچ گئے تو .....

"یہ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ اس طرح گھر سے نکلنا غلط ہے ـــ ایک مسافر نے سمجھایا

"ہاں بچو! گھر لوٹ جاؤ۔ بڑے مان جائیں تو بیاہ کر لینا۔ ورنہ صبر کر لینا۔ دوسرا مسافر بھی بولا

"پر .... پر .... ہم جائیں کیسے۔ جو پیسے تھے۔ ان سے ٹکٹ خرید لئے۔ اب تو ہمارے پاس کچھ بھی نہیں لڑکی نے بے ساختہ اپنی مجبوری ظاہر کر دی۔ کچھ دیر کی خاطر کمپارٹمنٹ کے اس حصہ پر خاموشی چھا گئی جو میری توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔ میں نے دیکھا۔ سب سے پہلے اسی آدمی نے اپنی جیب میں سے کچھ چھوٹے نوٹ نکالے اور لڑکی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہنے لگا۔

"اسے رکھ لو بیٹی۔ میرے پاس یہی تھے۔

نیکی کی ایک لہر اٹھی۔ پھر کئی ہاتھ ان کی طرف بڑھے۔ ذرا سی دیر میں تیس پینتیس روپے لڑکی کے ہاتھ میں پہنچ چکے تھے۔ میں نے بھی جیب میں ہاتھ ڈالنے کی خاطر اپنے جسم کو اک ذرا سا ترچھا کیا اور اتفاق

سے سامنے، نیچے کی برتھ پہ بیٹھی کالے سوٹ اور سبز دوپٹے والی عورت نے بھی اسی لمحے پہلو بدلا۔ بلاشبہ وہ ننھی تھی۔ اور ــــ وہ اپنی شلوار کے نیفے میں انگلی ڈالے ہوئے تھی۔ دوسرے ہی لمحے ننھی نے ہاتھ کھینچا اور اس لڑکی کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولی

"یہ رکھ اپنے دھورے۔ اب او کھلا آوے گا۔ میں بھی اُنگے اتروں گی۔ کھد ہی ٹکٹ لیجیو۔ اپنا بھی اور اس کا بھی۔ سمجھ بھی رہی یا یونہی دیدے پھاڑے دیکھو جاگی؟

لڑکی نے ہاتھ بڑھا کر ننھی سے سو روپے کا نوٹ لیا۔ جیب میں پڑا ہوا میرا خالی ہاتھ باہر نکل آیا۔ ٹرین کی رفتار بتدریج کم ہوتی جا رہی تھی۔ ——— ○

محور

مرسیڈیز ۱۲۱۰، ایرکنڈیشنڈ بس محض پل بھر کے لیے رُکی، کنڈکٹر نے پھرتی سے دروازہ کھولا اور وہ سُرعت کے ساتھ بس میں داخل ہوگیا۔ دو رویہ نشستوں پہ بیٹھے الفہد کنسٹرکشن کے بھارتی، پاکستانی اور بنگلہ دیشی ورکرز اسے دیکھ مسکرائے، ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا پاکستان کا مکرانی ڈرائیور پہلے تو قدرے اونچی آواز میں ہنسا پھر کھنکار کر گلا صاف کرنے کے بعد اونچی آواز میں بولا

"نصیبوں والا بندہ ہے ..... دمام میں بھی بیگم کی آواز سُن لیتا ہے۔

اس نے مڑکر مکرانی ڈرائیور کو دیکھتے ہوئے اُسی کی مانند بلند آواز میں جواب دیا۔

"صرف آواز سنتا ہوں ..... کبھی کبھی سنا بھی دیتا ہوں۔ جانتے ہو کیوں؟

"کیوں

"اس لیے کہ بھارتی ہوں۔ یہاں والوں کی زبان میں ہندو ..... استھان کا ہوں۔ ورنہ میرے گھر بھی فون لگا ہوتا پیارے اور ..... اور پھر ہم کیسٹ کے محتاج نہ ہوتے۔

اس کے جواب کو سن کر مکرانی ڈرائیور نے منھ بناتے ہوئے اک دم سے بس آگے بڑھا دی۔ مختصر سے سوال جواب پر الفہد کنسٹرکشن میں کام کرنے والے افراد نے مختلف انداز میں اپنا ردعمل ظاہر کیا۔ وہ ساتھیوں کے ردعمل کو نظر انداز کرتے ہوئے کھڑکی کے پاس خالی نشست پر بیٹھ گیا۔ ڈھیلی ڈھالی سوتی قمیض کی جیب میں سے روتھ مین کا ایک سگریٹ نکال کر اس نے دانتوں میں دبایا۔ دوسرے ہی لمحے وہ اس کے سرکو لائٹر کی آگ دکھا رہا تھا۔ چھوٹے چھوٹے دو تین کش لے کر اس نے SMOKE گلاس سے باہر نگاہ ڈالی، اونچی اونچی خوش نما عمارتیں پیچھے چھوٹتی جا رہی تھیں۔ کچھ دیر بعد ہی بس ہائی وے پر دوڑ رہی تھی۔ وہ اب بھی باہر ہی دیکھ

رہا تھا۔ اونچی اور سجل عمارتوں کی جگہ اب ریگستان نے لے لی تھی۔

"گھر میں سب خیریت ہے نا؟

اُس کے عقب سے ایک شناسا سا آواز سوال بن کر اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ جواب میں وہ مسکرا کر قدرے ترچھا ہوا۔ سوال کرنے والے ساتھی کو دیکھا اور اپنی مسکراہٹ کو مزید دل کش کرتے ہوئے اس نے پتلون کے بیلٹ میں پھنسے واک مین کا سوئچ آن کر دیا۔ چند ثانیہ بعد ہی اُس کے کانوں میں رس گھلنے لگا۔

"آپ ..... آپ آرہے ہیں ..... خدا کی قسم ..... سچ کہتی ہوں ..... دل کچھ زیادہ ہی دھڑکنے لگا ہے۔ بس ایسا لگتا ہے ..... ابھی ابھی مجھے پھولوں کی سیج پر بٹھا دیا گیا ہے۔ محلّے کی لڑکیاں کمرے کا دروازہ بند کر گئیں ہیں اور ..... کوئی پل جا رہا ہے۔ کہ آپ آئیں... ..... یہ دل اس روز کے بعد سے آج اسی انداز میں دھڑکا ہے ..... اسی انداز ..... اسی رفتار سے۔ لیکن نہیں ..... میں ..... میں ..... غلط کہہ گئی۔ ..... تب اور اب دل کے دھڑکنے میں ایک فرق ہے ..... میں اسے کوئی نام نہیں دے سکتی ..... بس اتنا کہوں گی تمام عمر.... ..... تمام عمر وہ پھر لوٹ کر نہیں آتی ..... جو پہلی رات میں ..... دلہن کو .... شرم آتی ہے۔ ..... مگر .... جانے کیوں .... آج اسی انداز میں شرمانے کو جی چاہتا ہے .... آپ .... جانتے ہیں .... کتنے دنوں بعد گھر لوٹ رہے ہیں۔ جانتے ہیں نا۔ یا ..... میں ہی بتاؤں .... پورے چار سال سات مہینے اور کچھ دن .... میں نے اس پورے عرصے کا ایک ایک پل گنا ہے .... سب کے ہوتے سوتے بھی میں اپنے کو تنہا تنہا سی محسوس کیا کرتی ہوں۔ صبح سے شام تک کی مصروفیت بھی تنہائی کا احساس کم نہیں کرتی ..... کیوں؟ آپ کو تو پتہ ہوگا۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ ہاں۔ ایک بات تو بتائیے۔ یہ .... کبھی کبھی ایسا کیوں لگتا ہے۔ میں بہت کچھ آپ سے کہنا چاہتی ہوں۔ سب کچھ ذہن میں ہوتا ہے ..... میں طے کر لیتی ہوں ..... یہ کہوں گی .... وہ کہوں گی ... یہ بتاؤں گی۔ وہ سناؤں گی۔ مگر ٹیپ ریکارڈ آن کرتی ہوں تو ساری باتیں اناپ شناپ سی لگتی ہیں۔ سوچتی ہوں۔ آپ کا دُکھ مجھ سے زیادہ ہے۔ آپ وہاں اکیلے ہیں ..... میرے پاس تو سب ہیں۔ ..... اماں ہیں۔ نند ہے ..... دیور ہے اور ..... اور گڈی ہے ..... گڈی ..... میری ..... آ ..... آپ کی گڈی ..... جب آپ گئے تھے اپنی گڈی ذرا سی تھی۔ بس ہمکا کرتی تھی.... کلکاریاں بھرا کرتی تھی ..... پر ..... اب تو خوب بولتی ہے۔ تتلا تتلا کر باتیں کرتی ہے۔

...

ارے ..... یہ لو ..... وہ اماں ..... اماں آرہی ہیں ..... اشارے سے کہہ رہی ہیں ..... میں بھی اپنے بیٹے سے دو باتیں کرلوں ..... بس کی رفتار میں ایک لطیف سے جھٹکے کے بعد تھوڑا سا اضافہ سب ہی نے محسوس کیا تھا۔

" شاہ جی کیا ارادے ہیں۔؟

" ارادے نیک ہیں برادر ۔ مکرانی ڈرائیور بستی کی نمائش کرتے ہوئے جواب دیتا ہے۔

" ذرا سنبھال کر چلاؤ بھائی ۔ سب بال بچے والے ہیں۔

" آپ کا میرے بارے میں کیا خیال ہے برادر

وہ ایک اچٹتی سی نظر ڈرائیور اور اسپیڈومیٹر پر ڈالنے کے بعد پھر کھڑکی سے باہر دیکھنے میں محو ہوجاتا ہے۔ یکایک بس کی خنکی اسے زیادہ ہی محسوس ہوتی ہے۔

..... " پیارے رفیق بیٹے ..... السلام علیکم ..... ہم سب خیریت سے ہیں۔ ..... اور اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ تمہیں بھی اپنی امان میں رکھے ..... اپنے دوست خلیل بھائی بھنڈی بازار والے کے ہاتھ تم نے جو کیسٹ بھیجا تھا۔ وہ میں نے بھی سنا۔ سن کر لگا۔ تم دمام میں نہیں۔ ادھر ہی ہو ..... برابر کے کمرے میں۔ ہمارے آس پاس۔ ہاں یہ جان کر بہت جی خوش ہوا کہ تم نے تین مرتبہ عمرہ کیا۔ ایک مرنے والے کے نام۔ پھر میرے لئے اور آخر میں اپنی دلہن کے لیے۔ اللہ تم تو بڑے نصیب والے رفیق میاں ..... پر میں پوچھتی ہوں کہ تم نے اپنے لئے عمرہ کیوں نہیں کیا؟ میرے اور اللہ بخشے بہشتی کے نام عمرہ ادا کیا۔ سو ٹھیک کیا۔ پر دلہن کے بجائے تم کو خود عمرہ کرنا چاہیئے تھا ....."

ڈرائیور نے ایک موڑ کاٹا تھا۔ سموک گلاس سے باہر دھوپ کچھ زیادہ ہی تیز ہوچلی تھی۔ ایک لمحہ کی خاطر اس نے پلکیں جھپکائیں پھر نشست پر پہلو بدلا کہ کھڑکی سے باہر سورج سموک گلاس میں تانبے کی ٹکیہ کی طرح چمکتے ہوئے اس کا ہم سفر تھا۔ ....." یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ تم آرہے ہو۔ اللہ تعالیٰ اپنے حبیب کے صدقے میں ساتھ خیریت کے تمہیں گھر لائے (آمین) ہاں۔ اب کچھ باتیں غور سے سنو ..... آنے سے پہلے اپنی زیبن کے لئے سونے کی ایک چین اور دو چار اچھی سی میکسیاں ضرور خرید لینا۔ دوستوں کے ہاتھوں جو کپڑے تم بھیجتے رہے ہو۔ اس میں سے زیبن کا حصہ میں نے اپنے ہاتھوں اس کے سپرد کیا ہے۔ لیکن اب زیبن کی فرمائش چین کی ہے۔ اس کا میاں بھی تمہیں بہت یاد کرتا ہے۔ پچھلے سنیچر کو میں زیبن کے گھر گئی تو کہنے لگا ..... بھائی کو خط لکھو تو میری

طرف سے لکھنا آتے وقت میرے لیے سیکو فائیو یا سٹی زن کوارٹس گھڑی ضرور لائیں۔ تمہاری بڑی اماں دو کرتوں کے کپڑے کی فرمائش کئی مرتبہ کر چکی ہیں۔ وہی سفید چکنے چکنے کپڑے کی۔ کیا کہتے ہیں اسے اور ہاں ۔ ایک جائے نماز بھی ان کے لیے ضرور لیتے آنا۔ اپنی بازو والی لمبی خالہ ہیں نا۔ ارے وہی مونس اور امتیاز کی اماں۔ وہ ناگون کی چٹائی کو کئی بار کہہ چکی ہیں۔ اور اب .... اب میں اپنے لیے تم سے کہہ رہی ہوں ...... غور سے سنو ...... میرے لیے سونے کی دو چوڑیاں ضرور لانا ...... اللہ بخشے بہشتی کو ...... ان کے زمانے میں ...... زندگی بس .... گزر گئی ...... وہ کہا کرتے تھے .... رفیق جوان ہو کر تمہیں عیش کرائے گا ...... خدا تمہیں جیتا رکھے۔ تم نے کوئی دکھ نہیں دیا۔ اچھا کھلایا۔ اچھا پہنایا۔ بس ...... اب یہ دو چیزیں لیتے آؤ ...... چوڑیاں اور مکہ شریف سے میرے لیے کفن خرید نے کے بعد اسے اللہ کے گھر سے مس ضرور کرنا ...... اب ...... اب زندگی کا کیا بھروسہ پتہ نہیں کب بلاوا آجائے۔ اور کیا کہوں ...... لو ...... وہ ...... وہ تمہاری گڈی آگئی .... خوب پٹر پٹر بولتی ہے۔ پر ابھی زبان صاف نہیں ہوئی ہے۔ تمہاری دلہن سے کہتی ہوں گڈی کو سالن کھلاؤ تھوڑا مرچ مصالحہ کھائے گی، تبھی تتلاہٹ ختم ہوگی۔ پر وہ سنتی کہاں ہے ...... ایک روز میں نے اسے ذرا سا سالن چکھا دیا۔ یقین کرو۔ آنکھیں تمہاری دلہن کی بھر آئی تھیں۔ اچھا اب اجازت دو ......"

........."سن لیں آپ نے اماں کی باتیں؟ ...... ہاں تو میں کیا کہہ رہی تھی؟ ...... ہوں۔ ہاں یاد آیا۔ میں نے ایک ایک پل گن گن کاٹا ہے۔ صرف اس لیے کہ اپنے حالات سدھر جائیں۔ خدا کا شکر ہے۔ اس نے کرم کیا۔ حالات سدھرتے ہی رہے۔ گھر کی دیواریں جو کلی چونے کو ترسا کرتی تھیں اب چم چماتی ہیں۔ کل ہم سب موٹا گاڑھا پہنتے تھے آج جاپانی کپڑوں میں سجے سجے پھرتے ہیں۔ گھر میں ٹیپ ریکارڈ ہے۔ ریڈیو ہے۔ کلر ٹی وی ہے۔ سب ہی کچھ تو ہے ...... بس ...... آپ کے گلف جانے سے ہماری روزمرہ کی زندگی بھی بدل گئی ہے۔ پہلے اماں فجر پڑھ کر مصلّے ہی پر تلاوت کیا کرتی تھی۔ آگے پیچھے ہل ہل کر ...... اب وہ صرف ہلا کرتی ہیں اور تلاوت مصری قاری کرتا ہے۔ آپ کے بھیجے ہوئے ٹیپ ریکارڈ پر ...... اماں تو بس بیٹھی جھوما کرتی ہیں ......"

ایک جھٹکے کے ساتھ بس کی رفتار کم ہوئی تھی۔ اُس نے چونک کر مکرانی ڈرائیور کو دیکھا۔ وہ دوبارہ گیئر بدل کر رفتار بڑھا رہا تھا۔ پچھلی نشست پر بیٹھا اروند بھنڈے اُس سے مخاطب ہوا۔

"ہے پاکستان چا ڈرائیور لوگ، لئی فاسٹ بھاگتو۔ کیا بولتا ہے رفیق بھائی۔ اس نے

سر گھما کر اثبات میں ہلایا

" پن کائے کو ؟ اپن پوچھتا جلدی کائے کی ..... سائٹ پہ جانے کا۔ ٹیم پہ جانے کا۔ کیا بولتا ہے رفیق بھائی ؟

" یہ کدھر بولتا ہے۔ بھینڈے کے برابر میں براجے ایک ساتھی نے کہا۔

" تو گپ بس ..... وہ گھر والوں کی باتیں سنتا ہے۔ لگی ہے۔ کیا بولتا ہے۔ ایک اپن ہے سالا باپ خط لکھتا نا بھائی ..... بس ..... ایک خط آتا ہے۔ اپن کی گرل فرینڈ کا.. ..... وہ بھی سالا تین مہینے میں ایک بار ..... کس کو بھی اپنا فکر چ نہیں ..... کیا بولتا ہے رفیق بھائی

اس نے ترحم آمیز نظروں سے اروند بھینڈے کو دیکھا اور پھر ہیڈ فون پر اپنی تمام توجہ مبذول کر دی۔

" سب ہی کچھ تو بدل گیا ہے۔ بس کمی ہے تو آپ کی ..... اب آپ آئیں اور ادھر ہی کچھ کریں۔ آپ کے بنا اب رہا نہیں جاتا ..... آپ نے پوچھا ہے۔ بتاؤ تمہارے لیے کیا لاؤں ؟ ہے نا۔ ؟ کیا واقعی ہی بتا دوں ..... اچھا تو سنیئے ..... لا سکیں تو وہ راتیں لیتے آیئے جو آپ کے بغیر گزر گئیں۔ وہ دن لے آئیں جن کی مصروفیتیں ہم مل بانٹ کر خوش ہوا کرتے تھے۔ اور ہاں سنیئے تو گڈی کیا کہہ رہی ہے ؟ یاد ہے نا۔ پچھلے کیسٹ میں اُس نے کیا کہا تھا۔"

آنکھیں بند کرتے ہوئے اس نے واک مین کا سوئچ آف کر دیا۔ اُسے پچھلے کیسٹ میں گڈی کی کہی ہوئی باتیں یاد آنے لگیں توتلی زبان میں اس نے کہا تھا۔

" چھلا مالیکم ..... پاپا ..... ہم اچھے ہیں ..... چھب اچھے ہیں ..... آپ کیچھے ہیں. ادل کیا بولیں پاپا ..... کچھ چھمج میں نئیں آتا ..... اچھا ایک بات چھنیے ..... ہمالی گلیا کی چھادی ہونے والی ہے۔ وہ ..... چلی جائے گی ..... آپ ..... اچھا آپ یہ گانا چھنیے ..... چھات چھمندل پال چھے گلیوں کے باجال چھے ..... اچھی چھی گلیا لانا۔ پپا جب بھی گھل آنا۔ پپا جب بھی تم آنا "

بس نے پھر ایک جھٹکا لیا تھا۔ اور اب اس کی رفتار بتدریج کم ہو رہی تھی۔ وہ سیٹ پر سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اور ایک وہی کیا۔ سب ہی سنبھل کر بیٹھے گیے تھے۔ کہ بس کچھ ہی لمحوں بعد ایک چوراہا آنے والا ہے جو برصغیر کے لوگوں میں خونی چوراہے کے نام سے مشہور تھا۔ اس چوراہے پر وہ ڈرائیور عموماً حادثے ہوا کرتے تھے جن کی طبیعتوں میں صبر کا فقدان ہو یا پھر تیز روی کی دھن میں جو ٹریفک کے بنیادی قواعد اور اس کے ابتدائی نکات فراموش کر دیا کرتے ہیں۔ مکرانی ڈرائیور

اس چوراہے کی آمد سے نصف فرلانگ قبل ہی بس کی رفتار کم کردیا کرتا تھا پر آج کسی رو میں اس نے رفتار کم نہیں کی تھی۔ اور اب ہنگامی طور پر اس نے بریک لگایا تھا۔ سب ہی نے بُرے بُرے منہ بنائے تھے ایک پاکستانی کے صبر کا پیمانہ چھلکا۔ جھنجھلا کر اس نے مکرانی ڈرائیور سے کہا۔

"شاہ جی کیا جلدی ہے

"تم فکر نہ کرو برادر

"فکر۔ کیا بولتا ہے؟ اروند بھینڈے چپ نہ رہ سکا۔

"اوئے تو چپ رہ

"چپ رہوں۔ منجے می گپ بسوں۔ گپتلے کائے۔ رفیق بھائی۔

"تجھے اپنی زندگی بہت عزیز ہے۔ موت سے ڈرتا ہے۔

"موت سے نہیں ڈرے گا تو کیا تیرے سے ڈرے گا۔ ابھی ہم دیکھا ج کیا۔

"گلف دیکھ لیا اور کیا رہ گیا۔ دوسرے پاکستانی ساتھی نے اروند بھینڈے کو چھیڑا۔

"گلف۔ ہنھ ..... ستیاناس کیا تم لوگ گلف کو۔ سالا

"ارے۔ سالا بولتا ہے۔ بھینڈے کو چھیڑنے والا اس پر برہم ہوا۔ فوراً ہی، دوسرے ساتھیوں نے معاملہ رفع دفع کیا۔ بس اب پھر تیزی کے ساتھ سائٹ کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اس نے پھر اسپیڈو میٹر کو دیکھا اور نگاہوں کا زاویہ تبدیل کرکے کشادہ ہائی وے کو دیکھنے لگا۔ دور، کافی دور سائٹ کی عمارتیں سراب کی لہروں میں لرزاں تھیں۔ پہلو بدل کر اس نے دوبارہ واک مین کا سوئچ آن کیا۔ گڈی کی آواز اس نے سُنی۔

"پاپا ..... چھلا مالیکم ...... ہم اچھے ہیں ..... آپ کیچھے ہیں؟ ..... ہم ممی کے چھات اچھ کول جاتے ہیں۔ گھل آکل کھیلتے ہیں۔ اول چھنیے۔ ہمالی گلیا کی چھادی ہوگئی ...... وہ چلی گئی ...... آپ ہمالی گلیا لانے والے تھے ...... ممی کہہ لئی تھیں آپ آئے ہیں پھیچ ...... مگل آپ تو آئے نئیں۔ اچھا ...... آپ جلدی چھے آجائیں۔ بچھ آپ آجائیں۔ اول جلدی چھے آجائیں۔ اول کیا بولیں۔ ہاں آپ نے کہا وہ گانا بھل چھنائیں۔ تو ...... چھنیے ...... چھات چھمندل پال چے گلیوں کے باجال چے۔ گلیا چاہے نا لانا۔ گلیا چاہے نا لانا۔ پپا جلدی آجانا۔ پپا جلدی آجانا پپا۔ پپا ......

"شاہ جی۔ سائٹ پہ آجاؤ

مکرانی ڈرائیور نے انجن بند کرتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ نگاہیں ملتے ہی اپنی سیٹ چھوڑ کر اس کی طرف لپکا۔ دوسرے پل وہ اس کے شانوں پہ ہاتھ رکھے ہوئے تھا۔ رفیق کی بھیگی آنکھیں دیکھ کر اس کی اپنی آنکھیں بھی بھر آئیں تھیں۔ دونوں آگے پیچھے بس سے اترے تھے۔ ابھی صبح کے ساڑھے سات بجے تھے لیکن سورج آگ برسا رہا تھا۔ اور ان کی نظروں کے سامنے سیدھی، بہت لمبی سڑک سورج کی طرف چلی جا رہی تھی۔

تال میل

وہ پریشان تھا یا حیران، خود اُس کی سمجھ میں نہ آیا۔ کبھی محسوس کرتا کہ اضطرابی کیفیت میں مبتلا ہے کبھی سوچتا، اس کے دماغ کی ایک ایک رگ، تحیّر کے شکنجے میں کس دی گئی ہے۔ سینے میں گوشت کا لوتھڑا اعتدال کی حدیں عبور کرتا دھڑک رہا تھا۔ اور وہ محسوس کر رہا تھا، تحیر و اضطراب کے درمیان۔ کسی دلدلی زمین پر کھڑا ہوا ہے۔ جو اُس کا بوجھ برداشت نہیں کر پا رہی۔ اُس کا اپنا تھوڑا تھوڑا۔ دھنستا جا رہا ہے۔

اب تک تو مجھے پوری طرح دھنس جانا چاہیئے تھا۔ لیکن دلدلی زمین کے اندر کسی سخت چٹان نے دھنسنے کے عمل میں رکاوٹ پیدا کر دی ہے۔ چٹان .....

باپ حیران تھا۔ اور ماں ـــــ پریشان۔ اُس نے دونوں کی بے چینی دیکھ لی تھی۔ اور حسرت بھرے انداز میں انہیں دیکھتا ہوا اپنی خواب گاہ میں داخل ہو گیا تھا۔ ماں۔ اس کے پیچھے کب چلی آئی تھی، اُس کا علم اُسے ہو ہی نہ سکا۔ ماں نے دیکھا۔ اُس کا بیٹا ڈائری لکھنے میں مصروف ہے۔

"یہ تو، ڈائری کب سے لکھنے لگا؟

چونک کر اُسنے ماں کو دیکھا۔ پھر ڈائری بند کرتے ہوئے بولا

بس۔ آج ہی لکھی ہے۔

دیکھوں تو

ہلاتے ہوئے اس نے ڈائری میز کی دراز میں منتقل کی۔ دراز کو مقفل کرنے کے بعد کنجی ڈالتے ہوئے اُس نے کہا

دیکھنے جیسی کوئی بات نہیں امّی

"کوئی ..... ماں کچھ لمحے کی خاطر رکی پھر بولی "کوئی بے چینی تجھے، پریشان کئے ہوئے ہے۔

"نہیں تو ـــ اُس نے جھوٹ بولا

"ماں سے چھپاتا ہے پگلے

ایک پل کی خاطر، محض ایک پل کی خاطر وہ مطمئن ہوگیا۔ اُس نے حسرت سے ماں کو دیکھا۔ دیکھتا ہی رہا۔ چونکا تو اس وقت جب ماں نے پوچھا

"کوئی لڑکی پسند آگئی ہے کیا

"آں ـ نہ .... نہیں امی

"تو پھر ..... یہ سب کیا ہے ؟ کیا دکھ ہے تجھے

"میں پچھلے دو روز سے .....

"ہاں۔ تو، پچھلے دو روز سے پریشان ہے۔ تو، ہی کیوں۔ ہم بھی پریشان ہیں۔ تیرے بابا حیران ہیں کہ تجھے کیا ہوگیا ہے ؟ اور میں ـــ اپنی پریشانی تجھے کیسے بتاؤں

"بتانا تو ـ میں بھی نہیں چاہتا

"اس طرح تو ہماری پریشانیاں اور بڑھ جائینگی۔

ماں اور بیٹا ـ دونوں ہی چونک پڑے ـ وہ تو ہڑبڑا کر کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اور اس کی ماں نے اپنی تمام توجہ اپنے شوہر پر مبذول کر دی تھی ـ جو کہہ رہا تھا ـ

"اگر تم اپنی پریشانی کو ـ کوئی نام نہیں دے سکتے ـ تو چلو ـ کسی اسپیشلسٹ سے تمہارا چیک اپ کرائے لیتے ہیں ـ

"نہیں نہیں ـ اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے بابا

"پھر

"دراصل ـ میرے دل ـ میرے ذہن میں ـ شک رینگ رہا ہے ـ یہ کیفیت ـ جس سے میں پچھلے دو روز سے دوچار ہوں میرے لیے بالکل نئی بھی نہیں ہے ـ لیکن میں ـ میں یقین کرنا چاہتا ہوں کہ دوسری مرتبہ میں پھر ـ اسی طرح کیوں محسوس کر رہا ہوں ؟ اور اس مرتبہ ـ میرا شک یقین کی کون سی صورت اختیار کرتا ہے

"شک ـ یقین، کیفیت ـ صورت ـ کیا کہہ رہے ہو ـ اور ـ اس مرتبہ سے تمہاری کیا مراد ہے ؟

"دراصل میں کسی نئے سانحہ کی اطلاع کا منتظر ہوں

"کیا مطلب ؟

پہلی مرتبہ باپ کا لہجہ کچھ سخت ہوا۔ ساتھ ہی اُسی کی پیشانی پر بل بھی پڑ گئے

"جی ہاں۔ اس سے پہلے۔ کوئی چھ سات مہینے پہلے بھی مجھ پر یہی کیفیت طاری ہوئی تھی۔ اور تیسرے روز بھائی میاں کے انتقال کی خبر آگئی تھی۔

ماں اور باپ دونوں کو بیٹے کی آواز۔ دُور بہت ہی دُور سے آتی ہوئی معلوم دے رہی تھی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو معنی خیز انداز میں دیکھا۔ اور سر جھکالیا۔ دونوں کی ذہنی رو صاعقہ کی طرح اپنے تمام عزیز واقارب کے طلایہ گردش کر رہی تھی۔

ایک بار۔ دوبارہ۔ کئی مرتبہ

"سب خیریت سے ہونگے۔ سب ہی

"تو۔ ناحق پریشان ہے۔ تیری، پچھلی کیفیت اور وہ اطلاع، محض اتفاق کے باعث تھی۔ ضروری نہیں......

ماں نے لرزتی ہوئی آواز میں بات ادھوری چھوڑ دی

دوسرے روز جب سورج کا غرور ٹوٹ رہا تھا تب کال بیل کی آواز پر ماں کے چہرے کا رنگ متغیّر ہوگیا۔ تیزی سے دروازے پر پہنچ کر اُس پی پنگ گلاس سے اُس پار دیکھا۔ ڈاکئے پر نظر پڑتے ہی۔ اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اُسی عالم میں اُس نے چٹخنی گرائی۔ کانپتے ہاتھوں سے دروازہ کھولا۔

"خط ہے

"نہیں۔ تار ہے

"ت۔ ا.... ر۔ دل و دماغ کے تمام تار ایکدم سے جھن جھنائے۔ لرزتے ہاتھوں سے دستخط کرنے کے بعد اُس نے دروازہ بند کیا۔ چٹخنی لگائی۔ لفافہ چاک کیا۔ پھر کچھ سوچ کر اُسے بغیر پڑھے ہوئے تیر کی طرح شوہر کے پاس پہنچی۔ شوہر نے بیوی کو دیکھا۔ پھر اُس کی نظر اُس کی مٹھی میں دبے ہوئے ٹیلی گرام پر پڑی۔ لمحے کے ہزارویں حصّے میں ایک روز پہلے، بیٹے سے کی گئی بات چیت کا خلاصہ کانوں میں گونج گیا حواس پر قابو پاتے ہوئے اضطرار کے عالم میں وہ بیوی کی طرف بڑھا۔

دھک، دھک۔ دھک

ٹائپ کے حروف نگاہوں میں اتر کر جسم کی رگ رگ میں سرایت کر گئے۔ اور پھر ان کے دل سے دھواں اٹھنے لگا۔

" خ .... خیر .... پت تو ہے نا۔؟ بیوی نے شوہر کی کلائی تھام کر پوچھا

" تمہارے بیٹے کا شک یقین کی منزل پر پہنچ گیا۔

" نہیں

" ہاں — منّی اپنے میاں کی جدائی کا صدمہ نہ سہہ سکی۔ اُس نے اپنی جان دے دی

ماں کی مسلسل چیخوں نے اُسے بیدار کیا تھا۔ دوڑتا ہوا وہ خواب گاہ میں پہنچا۔ وہاں پہنچ کر اُس نے دیکھا۔ ماں پلنگ کی پٹی پر بیٹھی زار زار رو رہی ہے اور باپ اُس کی کمر سہلا رہا ہے۔ اُس کے قدموں کی آہٹ پر باپ نے سر گھما کر اُسے دیکھا۔ اور ٹیلی گرام اُس کی طرف بڑھا دیا۔ ٹیلی گرام لیتے ہوئے اس کی اور باپ کی نظریں ملیں۔ باپ کی آنکھوں میں پلکوں کے کناروں پر رکے ہوئے آنسو اُس نے دیکھے اور پھر اپنی نظریں ٹیلی گرام کے حروف پر مرکوز کر دیں۔ اندر کہیں بہت ہی اندر ٹھیس پہنچی تھی۔ تصوّر کے پردے پر پل بھر کی خاطر ماضی کی پھلجڑی روشنی کا جھماکہ کر گئی۔ اور روشنی کی ہر کرن میں منّی کا سراپا اُسے نظر آیا۔ وہ سر جھکائے لوٹا۔ سر جھکانے سے پہلے۔ صرف ایکمرتبہ اُس نے باپ کی طرف دیکھا تھا۔

" میں تم سے — بیاہ کروں گی

" میں کروں گا تم سے شادی

" کیوں

" بس میں نہیں کروں گا

" پر — بوا کہتی ہیں۔ میرا بیاہ تم سے ہوگا۔

" بوا۔ تیری امّی ہیں۔ اس لئے کہتی ہیں

" اور جو — تمہاری امّی کہدیں تو کرو گے۔

" نہیں۔ تب بھی نہیں کروں گا

" کیوں۔ کیا میں اچھی نہیں؟

" نہیں

"کیا خرابی ہے مجھ میں ؟
"تو گندی ہے۔ تیری ناک بہتی رہتی ہے
"اور جو تمہاری دلہن ناک سنکتی آئی
"میری دلہن کیوں آئے گی ناک سنکتی۔ تیرا ہی میاں آئے گا چھینکتا ہوا۔
"دھت
"دھت کیا۔ میں سچ کہہ رہا ہوں
"اچھا بتاؤ۔ میرے میاں کو تم کیا کہو گے
"بھائی میاں۔ اور کیا ؟
"اور جو تم سے بیاہ ہوا۔ تب ـــ مجھے کیا کہو گے ؟
"تجھ سے بیاہ کروں گا ہی کیوں
"دیکھو ـ پچھتاؤ گے ـ میں تمہیں ـ بہت پیار دوں گی۔

البم کے کارڈ پلٹتے ہوئے وہ تھم گیا۔ تصویر میں منّی دلہن بنی اُس سے لپٹی رو رہی تھی اور اُس کا میاں منی سے لگا کھڑا تھا۔ اُسے بے اختیار منّی کی رخصتی یاد آ گئی۔ ہچکیوں کا گلا گھونٹ کر آنسوؤں کو پینے کے بعد۔ اپنی تمام تر فطری شرم و حیا کو گھونگھٹ کے کسی کونے میں رکھتے ہوئے اُس نے کہا تھا۔

"گھونگھٹ اٹھا کر تو دیکھو۔ میری ناک نہیں بہہ رہی ہے"۔

گرم گرم دو بوندیں البم کے جلیٹنگ کور پر گر پڑیں۔ اور ضبط کے سارے بندھن یکبارگی ٹوٹ گئے وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ روتے روتے جب بے حال ہوا تو خود اُس کی ناک بہہ رہی تھی۔ اور سسکتے ہوئے بہتی ہوئی ناک کو روکنے کی وہ ناکام کوشش کر رہا تھا۔

منّی کے چہلم میں وہ اپنی ماں کو لے کر آیا تھا۔ باپ ملازمت کی مجبوری کے باعث نہیں آسکا تھا۔ دن سوگ وار، رات غم میں ڈوبی۔ آنے والے آتے۔ ڈیوڑھی سے بین کرتے۔ منّی کی ماں دوپٹہ سے منہ چھپا کر بین کرنے لگتیں۔ پرسہ دینے والے بھی ان کا ساتھ دیتے۔ اور دو منٹ بعد بھرا پرا گھر منّی کی وفا شعاری کے ذکر سے گونجنے لگتا۔

مردان خانے میں مجلس اور فاتحہ کی منزلوں سے گذرتے ہوئے دسیوں بار اُسے منّی یاد آئی۔ لیکن اس نے ضبط سے کام لیا۔ کھانے کے بعد دسترخوان پلٹتے ہوئے۔ پھر اُس کا دل دھڑکنے لگا۔ شام تک اُس کی بے چینی بڑھ کر بے کلی کی صورت اختیار کر گئی۔ منّی کی ایک سہیلی نے اسے لیمو پانی کے دو تین گلاس پلائے لیکن اُس کا اضطرار بڑھتا چلا گیا۔ خالہ نے بھانجے کی کیفیت دیکھی تو منّی اور اس کے غم کو بھلا بیٹھیں۔ ماں نے بیٹے کو پھر اُسی عالم میں دیکھا اور کانپ کر رہ گئی۔ جوان جہان بچیوں کی موجودگی میں کچھ پوچھنے کی وہ ہمت ہی نہ کر سکیں۔ منّی کی ماں بہن کے کولہے سے لگیں سوال پہ سوال کئے جا رہی تھیں۔ اور اُس کی ذہنی رو پھر ایک مرتبہ عزیزوں کے طلایہ پھر رہی تھی۔ پل بھر میں ہزاروں میل کی مسافت طئے کرنے کے بعد وہ لوٹ آئی۔ اور اب تھکی ماندی ماں اپنی سوالیہ نظروں سے بیٹے کو دیکھ رہی تھیں۔

دوسرے روز بادلِ نخواستہ منی کی ماں اسباب باندھنے میں بھانجے کا ہاتھ بٹا رہی تھیں۔ اور وہ بستر بند کا بیلٹ کس رہا تھا چٹھی رساں کی آواز پر اُس کے ہاتھ رکے۔ بیٹے نے کنکھیوں سے ماں اور خالہ کو دیکھا۔ ماں نے انتہائی سراسیمگی سے بیٹے کو۔ بستر بند کے تسمے چھوڑ کر وہ دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

ٹیلی گرام وصول کرنے کے بعد اُس نے لفافہ چاک کیا۔ ٹائپ شدہ پیغام پڑھتے ہی مسکراہٹ اُس کے ہونٹوں پر پھیل گئی۔ ماں نے کواڑ کی اوٹ سے بیٹے کے چہرے کی بدلی ہوئی کیفیت دیکھی تو خود بھی بے اختیار مسکرانے لگی۔ لیکن اس ایک مسکراہٹ کی خاطر ماں کو ضبط کی کئی منزلوں سے گذرنا پڑا تھا۔ اور نہ جانے کیوں۔ اُس کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔ اُس سے برداشت نہ ہوا تو وہ بیٹے سے پوچھ بیٹھی۔

"کیا بات ہے چاند

"تار ہے امّی۔ ابّو کا، انہوں نے پوچھا ہے۔ کیا پھر تم نے وہی کیفیت محسوس کی اور.....

"اور کیا ــــ؟

"اور ایک خوشخبری بھی ــــ مجھے اسکالرشپ مل گئی ہے ــــــ ○

سہارا

اندھیرے میں چمکتی ہوئی پتلیوں پر دشمن کے خوف نے سایہ کیا تب اُس نے اپنی دناعی قوتوں کو سمیٹا، پل بھر کی خاطر گردن گھما کر بچّوں پر نگاہ ڈالی ۔ دُم اٹھائی ۔ اور پچھلے پیروں پر پورے وجود کا بوجھ سہارتے ہوئے پنجے پھیلانے کے بعد اُس نے ناخن چھوڑ دیئے۔ لحظ بھر کی خاطر نگاہوں کا زاویہ بدل کر اُس بند دروازہ کو دیکھا اور زور سے چیخی ۔

" یہ اپنی پھوسی کی آواز ہے ۔ شوہر کو جھنجھوڑتے ہوئے بیوی نے مخاطب کیا

" کیا بات کر رہی ہو ۔ پھوسی اور اس وقت ۔ سو جاؤ"

" نہیں ۔ آپ اٹھئے اور دروازہ کھول کر دیکھ لیجئے ۔ یہ ..... یہ اپنی پھوسی کی ہی آواز ہے

" کیسی باتیں کرتی ہو ۔ وہ کسی گھر میں الماری کے نیچے بچّوں کو لیے پڑی ہوگی

" پر

" اری پگلی ۔ تم ہی نے تو کہا تھا ۔ پھوسی بچے دینے کے بعد چھے گھروں سے ہوتی ہوئی اپنے گھر آئے گی ۔

" آں ۔ ہاں ۔ کہا تو تھا

بیوی نے آہستہ سے اعتراف کیا ۔ اسے اپنی کہی ہوئی بات یاد آگئی ۔ ابھی چند روز پہلے ہی تو اس نے اپنے میاں کے پوچھنے پر اُسے تفصیل سے بتایا تھا کہ پھوسی زچگی سے پہلے کسی ایک گھر کو منتخب کرے گی ۔ کچھ روز اپنے زچہ خانے میں گزار کر چھے گھروں میں قیام کرتی ہوئی وہ اپنے گھر آجائیگی ۔ بیوی سے تفصیل سن کر شوہر نے شرارت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے اُس سے پوچھا تھا ۔

" اچھا یہ بتاؤ ۔ اس کے کتنے بچے ہوں گے ؟
" چار
" کمال ہے ۔ میاں نے حیرت ظاہر کی تو اُس نے پوچھا
" کیوں ۔ آپ کو حیرت کیوں ہے
" اس لیے کہ ۔ اس حساب سے تو ہر طرف بلّیاں ہی بلّیاں نظر آنی چاہئیں
جواب میں وہ صرف مسکرا کر رہ گئی تھی ۔ شوہر نے اُسے مسکراتے ہوئے دیکھ کر پوچھا تھا
" کیوں تم مسکرائیں کیوں
" پڑھے لکھے ہو کر ان باتوں پر حیرت کر رہے ہیں آپ
" بھئی میں نے جانوروں پر ریسرچ تو نہیں کی
" اوپر والے نے آنکھیں کیوں دی ہیں ؟
" تم تو بحث کرنے لگیں ۔ میں ایک بات نہیں جانتا ۔ اس لئے تم سے پوچھ لیا
" سب قدرت کا نظام ہے ۔ بلّی ایک جھول میں چار بچے جنتی ہے ۔ سال میں دو بار
" اوہ ۔ یعنی آٹھ بچے
" جناب
" لیکن ہم اپنے آس پاس نگاہ ڈالیں تو بلیّاں کم ہی نظر آتی ہیں
" کہا نا ۔ سب قدرت کا نظام ہے ۔ بلّی ۔ بلّے سے چھپ کر بچّے دیتی ہے ۔ لیکن تمام تر احتیاطی تدابیر کے بعد بھی بلاؤ اُس کے بچے کھا جاتا ہے ۔ نہ کھائے تو ہر طرف بلیاں ہی بلیاں نظر آتیں ۔
" اُف
جھُرجھری لیتے ہوئے شوہر نے بیوی کو دیکھا اور کہا
" غضب کی ٹھنڈ ہے ۔ لگتا ہے کہیں اولے پڑے ہیں
" ارے یہ مہینہ ہی ٹھنڈ کا ہے
" ہاں ۔ جاتے ہوئے جاڑے ہیں ۔ اور تم نے ایکدم سے لحاف کی ساری گرمی نکال دی ۔
بیوی نے مسکرا کر شوہر کو دیکھا ۔ پھر اُس کی طرف کروٹ لیتے ہوئے ۔ اُسے اپنے سے لپٹاتے ہوئے سر تک لحاف کھینچ لیا ۔

ناخن چھوڑتے ہوئے پنجے پوری طرح پھیل چکے تب اُس نے پھر ایک بار بند دروازہ کو دیکھا۔ اُس کی نگاہ بند کواڑوں سے ٹکرا کر لوٹ رہی تھیں تو چاروں لجلجلاتے بچوّں کو دیکھتے ہی اُس میں دشمنوں سے ٹکرانے کا عزم پختہ ہو چکا تھا۔

کتوّں کی ہلکی سی غراہٹ نے اُس کی توجہ اپنی طرف مبذول کی۔ تو اُس نے دیکھا وہ دو ہیں۔ اور۔ اُن میں سے ایک کاوا کاٹ کر اُس کے بچوّں کی طرف بڑھ رہا ہے۔ جبکہ دوسرا اس کے مقابلے پر ڈٹا ہوا ہے۔ کاوا کاٹنے والے کتے نے دبی ہوئی غراہٹ سے اپنے ساتھی کو مخاطب کیا۔ جونہی کاوا کاٹنے والے ساتھی کی شہ پاکر دوسرا آگے بڑھا تو کاوا کاٹتے ہوئے کتے نے بچوّں کی طرف قدم بڑھائے۔ اُس نے پل بھر میں صورتِ حال کو سمجھا۔ دشمنوں کی حکمتِ عملی اُس کی سمجھ میں آچکی تھی۔ ایک بار پھر اُس نے اپنے پچھلے پیروں کی طاقت کا اندازہ کیا۔ اور مدِ مقابل کو جھکائی دے کر بچوّں کی طرف بڑھتے دشمن پر چھلانگ لگادی۔ حملہ قطعی غیر متوقع تھا، اور متاثر بھی۔ اُس کے ناخن دشمن کے جسم پر خراشیں چھوڑ گئے۔ لیکن اپنے کامیاب حملے کا ردِ عمل دیکھنے کی مہلت اُسے نہ مل سکی۔ کیوں کہ اُس نے دیکھ لیا تھا کہ دشمن اس کے بچوّں کے قریب پہنچ چکا ہے۔ اُس نے پھر جست بھری۔ دشمن۔ اس حملے کے لیے پوری طرح تیار تھا۔ وہ ایک دم سے پیچھے ہٹا۔ اس کا حملہ ناکام رہا۔ لیکن اس سے پہلے کہ دشمن سنبھلتا اُس نے پھر حملہ کیا کتے نے اس حملے سے بچنے کی خاطر اپنے کو زمین پر گرالیا۔ اور جوں ہی وہ اس پر گری۔ اُس نے اپنے اگلے دو پیروں میں اُسے جکڑتے ہوئے منہ سے عجیب سی آواز نکالی۔ کافی دیر تک وہ غراتا رہا۔ وہ بھی چیختی رہی مسلسل حملے کرتی رہی۔ اس کے مسلسل حملوں سے دشمن لہولہان ہو چکا تھا۔ چند لمحوں بعد جب وہ کسی نہ کسی طور اُس کی گرفت سے آزاد ہوئی۔ اور اُس نے بچوّں کی طرف دیکھا تو اُس کی آنکھوں میں سرخ ڈورے اتر آئے۔ اُس کے اپنے وجود کا حصّہ بری طرح تڑپ رہا تھا۔ اور کتے کے دانت اس کی ننھی سی گردن میں پیوست تھے۔ اک ذرا سا پیچھے ہٹ کر اُس نے کتے پر حملہ کیا اس حملے میں اُس نے کتے کی پشت سے پارچہ اتار لیا۔ کتا بچّے کو چھوڑ کر اُس سے بھڑ گیا۔ کافی دیر تک دونوں گتھم گتھا رہے، کبھی کتا اس پر حاوی ہوتا اور کبھی وہ کتے پر۔ تڑپتے ہوئے بچے کو دیکھ کر اُس کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ اور وہ انجام سے بے پرواہ ہو کر دشمن سے بھڑ گئی تھی۔ چاروں پنجوں کے ناخنوں نے جب کتے کو بری طرح زخمی کر دیا تو وہ جان بچا کر بھاگا۔ ایک پل کے لیے بھاگتے ہوئے کتے کو دیکھتے ہوئے اس نے کچھ سوچا۔ پھر تیزی

سے مڑ کر بچّوں کو دیکھا تو۔

لیمپ پوسٹ کی مدھم روشنی میں اُس نے دیکھا دیوار کے نیچے کتا بچے کا اگلا بازو چبا رہا تھا پھر ایک مرتبہ اُس نے پچھلے پیروں پر سارے بدن کا بوجھ سہارا اور کتے پر جا پڑی۔ حملہ اس قدر نپا تلا تھا کہ دشمن کو سنبھلنے کا موقع ہی نہ ملا۔ اور اس قدر موثر کہ دشمن تکلیف کی شدت سے چلاتے ہوئے رونے لگا۔

اب خود وہ بھی اپنے کو کم زور محسوس کرنے لگی تھی۔ اپنا ضعف محسوس کرتے ہی اُس نے بچوں کو دیکھا۔ پھر بے چارگی سے بند کواڑوں کو۔ دوسرے ہی پل وہ اپنی جگہ سے اچھلی اور کواڑوں پہ جا پڑی۔ اٹھی۔ اور سنبھل کر اُس نے دروازہ کی طرف منھ کرتے ہوئے زور سے آواز لگائی۔

دروازہ کی آواز۔ انہوں نے پہلے سنی، اور پھر اُس کی اونچی دل دوز چیخ بھی۔ سروں سے لحاف ہٹاتے ہوئے بیوی نے شوہر کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ اشارے ہوئے۔ شوہر نے پہلو بدل کر تپائی پر سے اپنی رسٹ واچ اٹھائی۔ وقت دیکھا اور لحاف سے نکلتے ہوئے بولا

"تمہارا خیال ٹھیک ہے۔ یہ۔ اپنی پھوسی ہی ہے۔

"مجھے لگتا ہے وہ خطرے میں ہے۔

"یہ کیسے کہہ سکتی ہو

"پہلے آپ جاکر اُسے دیکھیں

اُس نے لحاف اٹھا کر شوہر کی طرف بڑھایا۔ شوہر نے لحاف لے کر کندھوں پر ڈالا۔ پھر اُسے اپنے گرد اچھی طرح لپیٹ کر کمرے پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالنی شروع کی۔

"کیا دیکھ رہے ہیں؟ بیوی نے پوچھا

"کوئی لکڑی۔ بید۔ یا ڈنڈا۔

"افوہ آپ جائیں تو

"کمال کرتی ہو۔ رات کے تین بج رہے ہیں۔ اور میں خالی ہاتھ باہر نکل جاؤں

"افوہ۔ آپ چلئے۔ میں لاتی ہوں بید۔

بیوی نے پلنگ چھوڑتے ہوئے کہا۔ شوہر دروازے کی طرف بڑھا اور بیوی کچن کی طرف۔

وہ ابھی دروازہ تک پہنچا بھی نہ تھا کہ اُس نے پھر پھوسی کی آواز سنی۔ ساتھ ہی کتوں کی غراہٹ بھی۔ اُس نے مڑ کر دیکھا۔ بیوی ہاتھ میں بید لیے کھڑی تھی۔ اُس سے بید لینے کے بعد اُس نے لپک کر دروازہ کھول دیا۔

دروازہ کھلتے ہی بلّی اور کتوں کی جنگ ختم ہوگئی۔ پھوسی اُسے دیکھتے ہی کود کر دیوار پر جا بیٹھی۔ اُس نے کتوں کو دوڑایا۔ کمرے میں سے بیوی نے برآمدے کا بلب روشن کر دیا۔ اور شوہر کے پیچھے جا کر کھڑی ہوگئی۔ میاں کے کندھوں سے گذرتی ہوئی اس کی نظروں نے برآمدے میں اور برآمدے سے اک ذرا باہر صحن میں عجب منظر دیکھا۔ ایک طرف ایک کتا لہولہان گھسٹ رہا تھا۔ دوسرا دم دبائے لڑکھڑاتی چال میں صدر دروازہ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ پھوسی دیوار پر بیٹھی بڑے غور سے ان دونوں کو دیکھ رہی تھی۔

"پھوسی۔ پھوسی

اُس کے شوہر کے پکارنے پر پھوسی نے اک ذرا سا اپنے جسم کو بلند کیا۔ اور زمین پر کود گئی تھکے تھکے قدم اٹھاتی ہوئی وہ دونوں کے قریب پہنچی۔ لرزتی سی آواز نکالی۔ اور اپنی مالکن کے پیروں پر سر رگڑنے لگی۔ وہ بیٹھ گئی۔ اور پھوسی کو ہاتھوں میں اٹھا کر اُس کا سر سہلانے لگی۔ پھر جب اُس نے پھوسی کی کسمساہٹ محسوس کی تو اپنی گرفت ڈھیلی کر دی۔

میاں بیوی نے دیکھا۔ پھوسی کود کر تیزی سے کبھی ایک بچّے کی لاش کی طرف جاتی تھی اُسے سونگھتی تھی۔ اپنی زبان سے اُس کے لاشے کو چاٹتی پھر دوسرے بچّے کی لاش پر پہنچ کر۔ وہی عمل دہراتی۔ دروازہ کے قریب دو زندہ بچّے ہنوز بلبلا رہے تھے ——— ○

سلسلہ

ٹرین پلیٹ فارم پر رُکی تو اس نے اپنی نظروں کے حصار کا دائرہ بڑھانا شروع کیا۔ پہلی کوشش میں ناکام ہونے کے بعد وہ پلیٹ فارم پر اُتر گیا۔ اُس کے پیچھے ہی بیوی اور لڑکا بھی اتر آئے۔ لڑکے کے ہاتھ میں وی۔ آئی۔ پی کا سوٹ کیس تھا اور بیوی کے کندھے پہ کیری بیگ' اِدھر اُدھر نگاہ دوڑاتے ہوئے اس کے چہرے پہ کبھی مایوسی کے سایے پڑتے تو کبھی جھنجھلاہٹ کی وجہ سے اس کا چہرہ تمتمانے لگتا۔ چائے گرم، دودھ لے لو دودھ، متھرا کے پیڑے سستے ہیں جی سستے، لسی، ٹھنڈی میٹھی لسی، پیو جی لسی، گرمی کی دشمن ہے جی دشمن،

کوٹہ جنکشن۔ بہت بڑا ریلوے اسٹیشن تو نہیں۔ پھر بھی اس قدر شور ہے۔ جھنجھلاہٹ بڑھنے لگی تو وہ دو قدم بڑھ گیا۔ پھر اپنے دائیں شانے پر ہلکا سا دباؤ محسوس کرتے ہی اس نے مڑ کر دیکھا۔ اُس کی بیوی پلیٹ فارم کے داخلی دروازے کی طرف آنکھوں سے اشارہ کر رہی تھی۔ لڑکے نے ماں باپ کی نگاہوں کا تعاقب کیا تو جانا وہاں سولہ سترہ برس کی گندمی رنگت کی ایک لڑکی موجود ہے۔ اس نے پھر اپنے ماں باپ کو دیکھا جو ایک ساتھ اسی لڑکی کی طرف بڑھ رہے تھے۔ سوٹ کیس کو دوسرے ہاتھ میں لینے کے بعد وہ بھی ان کے پیچھے چل دیا۔ اور جب وہ ان کے قریب پہنچا تو اس کے کانوں سے لڑکی کی آواز ٹکرائی۔

" میں ..... ایڈنا .... مِل ڈریڈ، ڈی میلو کی چھوکری

" مِل ..... مِل کیسی ہے؟

اُس نے ایڈنا کو گلے لگانے کے بعد پوچھا

" ناٹ بیٹر۔ انکل۔ پلیز کم وِدھ مِی

ایڈنا اُس کی بیوی کے شانے سے کیری بیگ اتارتے ہوئے بولی۔ اسٹیشن سے باہر نکل کر ایڈنا نے

دو آٹو ہائر کیے۔ ایک پہ ماں اور بیٹے بیٹھے اور دوسرے پر وہ خود ایڈنا کے ساتھ۔ وہ پہلی مرتبہ مل ڈریڈ کے گھر جارہا تھا۔ فیروزجی کی ٹیری پندرہ منٹ بعد وہ سبھی ڈی میلو ہاؤس کے صدر دروازے پہ کھڑے تھے۔ خود مل ڈریڈ دالان میں پڑی ایزی چیئر پر بیٹھی مسکراتے ہوئے ان کا استقبال کر رہی تھی۔ اُس کی بیوی دوڑ کر مل ڈریڈ سے لپٹ گئی۔ اُس کی حالت دیکھ کر اس کا دل بھر آیا۔

" وائی یو اسٹینڈنگ دیر۔ کم آن

زخمی اور تھکی ماندی مسکراہٹ ہونٹوں پہ سجائے وہ آگے بڑھا۔ ملڈریڈ کے قریب پہنچ کر ایزی چیئر کی ہتھیوں پہ جھکتے ہوئے اس نے ملڈریڈ کی آنکھوں میں جھانکا۔ دونوں کی نگاہیں چار ہوئیں۔ دوسرے ہی پل مل ڈریڈ نے گڑبڑا کر دائیں بائیں دیکھا

" تم بالکل نہیں بدلی ہو مل

" ہیو۔ یو۔ چینجیٹ ؟

" بس ــــ اتنا ــــ جتنا تم نے چاہا تھا

" نکہت کیسی ہے ؟ مل ڈریڈ نے اُس کی بیٹی کی خیریت معلوم کی تو وہ مسکرا کر رہ گیا

" بہت اچھی ہے۔ اُس کی بیوی نے جواب دیا" ہمیں سوار کرانے آئی تھی اپنے میاں کے ساتھ...
تمھارے لیے افلاطون کی مٹھائی بھیجی ہے اُس نے اور جانتی ہو۔ کیا کہا اُس نے مجھ سے

مل ڈریڈ کی سوالیہ نظریں اس کی بیوی کے چہرے پر مرکوز ہوئیں تو وہ ہنستے ہوئے بولی

" اس نے کہا۔ پاپا کی ڈاؤ کو دیدینا۔ پاپا کی بیٹی کی طرف سے

" اوہ۔ جھینپ کر مل ڈریڈ نے کنکھیوں سے اسے دیکھا پھر موضوع بدلنے کی خاطر اس سے بولی

" چلو اندر چلتے ہیں ...... ذرا مجھے سہارا دے کر اُٹھاؤ۔ اوہ۔ تھینک یو .....

کمرے میں بچھی سالخوردہ مسہری پر تکیے کے سہارے نیم دراز ہونے کے بعد مل ڈریڈ دیر تک اُس سے نکہت کے بارے میں پوچھتی رہی اور وہ بور ہوتا رہا۔ کیونکہ وہ جلد از جلد اس سے اصل موضوع پر بات چیت کا خواہاں تھا۔ مزید کچھ دیر بور ہونے کے بعد اس سے برداشت نہ ہوسکا تو وہ پوچھ بیٹھا

" تم نے بلایا کیوں تھا ؟

" بیٹھو آرام سے ..... چائے پی لو ..... ایڈولاتی ہوگی ..... پھر نہا دھو کر آرام کرنا۔
جب تھکن اُتر جائے گی تو ہم بات کریں گے۔

" لمبا کاوا کاٹنے کی عادت آج بھی ہے

" میں نہیں بدل سکی ظفر ..... بدلے تو ..... تم بھی نہیں ہو .....

" ایک بات پوچھوں ـــــ ظفر نے کمرے پہ نظر ڈالنے کے بعد اس سے پوچھا" کئی بار سوچا۔ پوچھوں خط لکھ کر ہی پوچھوں، لیکن یہ سوچ کر پوچھنے کی ہمت نہ ہوئی کہ میرا خط مائکل کے ہاتھ نہ لگ جائے

" میں نے مائکل کو سب کچھ بتا دیا تھا۔ ہمارے سینپ بھی اس نے دیکھے تھے۔ اور ..... ہاں تم کیا معلوم کرنا چاہ رہے تھے ؟

" پچیس ..... سال پہلے جو فیصلہ تم نے کیا تھا۔ مائکل سے شادی کے بعد اس پر تم نے .... کبھی سوچا

ظفر کا سوال سن کر وہ خالی خالی نظروں سے اسے دیکھتی رہی پھر اپنا ہاتھ اس کے بائیں شانے پر رکھتے ہوئی بولی

" پہلے سوچا تھا۔ کچھ پانے کے لیے چھوڑنا پڑتا ہے۔ لیکن ..... جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ مائکل نے بھی سرینڈر کیا تو ..... تو مجھے لگا۔ میں نے بہت کچھ چھوڑ دیا۔ مائکل جب تک جیا۔ مجھ میں ڈیسیرو کو دھونڈتا رہا۔ اور میں ..... یوں سمجھو۔ ہم دونوں ایک دوسرے میں اپنی پسند کے سایے ڈھونڈتے رہے۔ اور ہارتے رہے۔ اس نے اپنا غم وہسکی کے گلاس میں ڈبویا اور میں ..... میں سوچتی کہ ..... جن کے ڈر سے میں نے تمھیں چھوڑا ..... وہ خود مجھ سے چھوٹتے چلے گئے ..... میری لائف ..... تو اسٹینوگرافی کرتے بیتی یا مائکل کے بچے جنتے۔ ہاں ـــــ ایک بات آج تک میری سمجھ میں نہ آئی جب لائف پارٹنر ایک دوسرے کو پسند ہی نہیں کرتے تو بچے کیسے پیدا کر لیتے ہیں ؟

" فرائڈ کا خیال ہے۔

" اس کی بات مت کرو۔

" کیوں۔ وہ سائکلوجی کا ماسٹر تھا۔

" ہاں تھا۔ اپنے پیریڈ کی بیمار سوسائٹی کی انالسس کرتا تھا۔ آج ہوتا تو چکرا کر رہ جاتا مگر اس کی تھیوری آج بھی .....

" چھوڑو۔ فرائڈ کو۔ اپنی سناؤ۔ سچ سچ بتاؤ ..... میرے بن ..... زندگی کیسے گزری ظفر نے غور سے ملڈریڈ کو دیکھا۔ کچھ سوچا اور مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔

" ابھی۔ پانے اور چھوڑنے کی سائکلوجی تم نے بیان کی تھی۔ یوں سمجھو۔ میں نے پایا زیادہ ہے۔

تمھاری جدائی نے مجھے کچھ زیادہ ہی سینس سٹیو کر دیا۔ میں نے شروع شروع میں تمھیں تلاش کیا تھا۔ لیکن ظاہر ہے کہ کامیاب نہ ہو سکا۔ اس لیے میں نے اس کو سب کچھ بتا دیا۔ یو'۔ بلیومی مِل۔ بڑی غضب کی عورت ہے شمیم ــــ اُس نے جتنا ممکن ہو سکا اپنے کو بدلا۔ خود میں بھی چینج ہوا۔ تمھارے ساتھ جو فوٹو تھا وہ ہمارے ڈرائنگ روم میں لگا ہوا ہے جانتی ہو کیوں۔ اس لیے کہ ایک دن شمیم نے مجھ سے کہا۔ اپنا اور مِل کا فوٹو چھپاتے کس سے ہیں۔ جب اسے چاہتے تھے تو ڈر کیسا دیر سویر بچّے اسے دیکھ ہی لیں گے۔ اور اُس وقت ان کے سوالوں سے شرم آئے گی۔ اس لیے اچھا ہوگا انھیں ابھی سے معلوم ہو کہ ہمارا پاپا ان سے شادی کرنا چاہتا تھا۔

" اوہ نو ــــ

" یقین کر یہ سچ ہے۔ اور اس وقت تو میری حیرت دوچند ہو گئی مِل۔ جب ایک دن اُس نے مجھ سے کہا کہ جن لوگوں نے عشق نہیں کیا وہ بے کیف زندگی گزارتے ہیں۔

" اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ..... ملڈریڈ نے کچھ کہنا چاہا تھا لیکن ظفر نے بات کاٹ دی" نہیں۔ ویسا کچھ بھی نہیں تھا۔ جو تم نے سوچ لیا۔ میں اس کی پاسٹ لائف کی ہر گلی میں گھوم آیا ہوں" اوہ ــــ ملڈریڈ نے اس کے شانے پر سے اپنا ہاتھ ہٹا لیا۔ ظفر نے استفہامیہ انداز میں اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کچھ کہنا چاہا تھا لیکن قدموں کی آہٹ سن کر خاموش بیٹھا رہا۔ ایڈنا چائے لے آئی تھی۔ اُس نے غور سے ایڈنا کو دیکھا اور اُسے لگا وہ برسوں پیچھے لوٹ گیا ہے۔

بیرام جی جی بھائی کے دفتر میں اسٹینو گرافر کی اسامی خالی ہوئی تھی۔ اور ملڈریڈ اپنی ماں کے ساتھ انٹرویو دینے کی خاطر وہاں پہنچی تھی۔ ڈیڑھ گھنٹے کی امتحانی منزل سے گزرنے کے بعد بیرام سیٹھ نے پورے اسٹاف سے اسے متعارف کروایا تھا۔ ماں کو رخصت کرنے کے بعد وہ اسٹاف کے ہر فرد کا جغرافیہ معلوم کرتی رہی تھی۔ اپنے بارے میں دو چار جملے کہہ کر میں نے پہلے ہی دن اُس سے مذاقاً پوچھا تھا۔

" عام طور پر تمہاری کمیونٹی کی لڑکیاں انٹرویوز پر اپنے بوائے فرینڈز کو ساتھ لاتی ہیں۔

" کیا مطلب ؟

" تم اپنی ماں کے ساتھ آئی ہو

" میرا کوئی بوائے فرینڈ نہیں ہے

" میں اپنی خدمات پیش کروں ؟

"اوہ ــــ شریر ــــ پھر بھی سوچوں گی ۔ لیکن اتنا یاد رکھنا میں کامن کرسچیئن گرلز میں سے نہیں ہوں۔
"ہر لڑکی یہی ڈائیلاگ بولتی ہے
"کتنی پٹا ئیں آج تک
بے ساختہ سوال پر وہ جھینپ کر رہ گیا تھا اور سننے والوں نے قہقہہ بلند کیا تھا۔ ساتھیوں کا یہ قہقہہ اُسے ناگوار گزرا تھا اُس نے غور سے مِل ڈریڈ کے سراپے کا جائزہ لیا تھا۔ ایک عام سی گوانیز لڑکی تھی۔
ابتدائی دو مہینے تو وہ قدرے محتاط رہا پھر اُس نے محسوس کیا کہ ملڈریڈ اس کی زندگی کی لازمی ضرورت ہوتی جارہی ہے۔ اِدھر ملڈریڈ بھی اندر ہی اندر اُسے پسند کرچکی تھی دفتر سے چھوٹنے کے بعد وہ چرچ گیٹ کے نسبتاً ویران ٹی شاپ پر پہنچ جاتے۔ دنیا جہان کی باتیں ہوا کرتیں، پھر ٹی شاپ کی ملاقاتیں موقوف ہوئیں۔ سینما ہال کا اندھیرا انھیں پسند آیا۔ دور دراز کے کم معروف ریستوران منتخب کیے گئے۔ اور ایک روز ہنگامہ ہو ہی گیا۔ مِل ڈرید پورا ایک ہفتہ دفتر نہ آئی اور جب آئی تو اس کی آنکھیں متورم تھیں۔ اس نے بتایا کہ ممی اور بھائیوں نے اسے خوب پیٹا کہ تو ایک مسلمان لڑکے کے چکّر میں پڑی ہے۔ ظفر ہمت کر کے اس کے گھر پہنچ گیا۔ اُس نے ملڈریڈ کا ہاتھ طلب کیا تو ماں نے بیٹوں کی موجودگی میں اس سے کہا
"اِس شرط پہ کہ تم کنورٹ ہو جاؤ
اس نے سہمی ہوئی ملڈریڈ کو دیکھا جو نفی میں سر کو جنبش دے رہی تھی۔ صورتِ حال کی نزاکت پر غور کیے بنا اس نے اس کی ماں سے کہا
"آپ بھول رہی ہیں کہ وہ بالغ ہے۔ میں رجسٹرار آفس میں اُس سے شادی کرسکتا ہوں۔
"آف کورس
ملڈریڈ کا بھائی رابرٹ بیچ میں بول اُٹھا
"کرسکتا ہے مین۔ مگر یہ اُدھر جائے گی تب نا ــــ ہم اس کا ٹانگ توڑ دے گا اور تمھارا تو باڈی بھی نہیں ملے گا۔ ذرا باہر جاکر پوچھو رابرٹ کون ہے؟
"پلیز تم جاؤ ظفر ــــ تم جاؤ
"ہاں ــــ جاؤ ــــ اور یاد رکھو۔ زندہ رہنے کا ہے تو اس کو بھول جاؤ۔ نہیں تو ......
عجیب عالم میں وہ ملڈریڈ کے گھر سے اٹھا تھا۔ غصّہ اس کی نسوں میں خون کے ساتھ گردش کر رہا تھا۔ اور بے عزتی کا احساس اُس کے پیروں میں ورتی تاروں کی مانند پڑچکا تھا۔
پندرہ روز بعد ملڈریڈ لاؤ شکر کے ساتھ دفتر آئی۔ بیرام سیٹھ کو استعفیٰ دے کر جب وہ لوٹی

تھا۔ تب بس دو منٹ کی خاطر وہ ظفر کے پاس رُکی تھی اور کہا تھا۔

"ایک وعدہ کرو ظفر۔ زندگی میں۔ جب بھی۔ میں تمھیں بلاؤں گی۔ تم میری مدد کو آؤ گے

"تم مجھے یاد رکھو گی۔

"میں تمھیں ـــ بھلا نہ سکوں گی ظفر۔

"میں وعدہ کرتا ہوں۔ زندہ رہا تو ضرور آؤں گا۔

"ایک ریکوئسٹ اور ہے۔ تم شادی ضرور کرنا۔

"تم کرو گی

جواب میں ملڈریڈ نے اپنا بایاں ہاتھ اُس کی طرف بڑھا دیا تھا۔ درمیانی انگلی کے برابر والی انگلی میں سونے کی انگوٹھی موجود تھی۔ مرکیوری لائٹ کی شعاعیں انگوٹھی پر سے ریفلکٹ ہو کر اُس کی آنکھوں میں چبھنے لگیں تو اس نے مُنہ پھیر کر ملڈریڈ سے چلے جانے کو کہا تھا۔

اُسی روز شام کو اُس کی ماں اور بہن نے شادی کے مسئلہ پر اسے پھر گھیرا تو اُس نے اجازت دیدی ماں تو شمیم کا انتخاب کیے بیٹھی تھیں۔ کب منگنی ہوئی اور کب شادی۔ پتا ہی نہ چلا۔ بیاہ کے بعد چند روز تک ملڈریڈ اسے بہت یاد آئی لیکن اس کے بعد اس کی یادوں کی شدت پر شمیم کا پیار غالب آتا چلا گیا۔ اُس نے شمیم کو سب کچھ بتا دیا۔

پورے ڈیڑھ برس کے بعد اُس کے گھر میں نکہت پیدا ہوئی۔ اُس نے اپنے مشترکہ دوست کے ذریعہ ملڈریڈ کے ماں بننے کی خبر سنی۔ اُس نے ایک بیٹے کو جنم دیا تھا۔ ابھی نکہت دیوار کے سہارے یا گڈولنے کے سہارے ہی چلنے پائی تھی کہ وہ ایک بیٹے کا بھی باپ بن گیا۔

زندگی کی تیز رفتاری کے باوجود وہ روز ہی چھپ کر ملڈریڈ کو یاد کرنا نہیں بھولا تھا۔ ایسے ہی ایک دن جب وہ اپنی اور ملڈریڈ کی تصویر دیکھ رہا تھا تب شمیم نے اس سے کہا تھا۔

"اس فوٹو کو چھپ چھپ کر دیکھنے سے کیا فائدہ۔ آپ نے انھیں چاہا تھا۔ اس پر آپ کو فخر بھی ہے تو پھر اسے ہال کی دیوار پر لگائیے۔ کل۔ جب نکہت اور امی بڑے ہوں گے اور اچانک ان کے بارے میں پوچھیں گے تب آپ کو شرم آئے گی۔ لیکن۔ ابھی سے اس تصویر کو دیکھنے کے بعد وہ ہزاروں سوالات ان کے ذہنوں میں جگہ نہ پا سکیں گے جو برسوں آپ کی دماغی چولیں ہلا سکتے ہیں۔

شمیم کی رائے سے متفق ہو کر اُس نے تصویر دیوار پر آویزاں کر دی۔ دن گزرا کیے۔ ایک روز سرِراہ ملڈریڈ کی ماں سے مُلاقات ہوئی۔ بوڑھی اسیی بجھ کر رہ گئی تھی۔ اس کے استفسار پر اس نے

بتایا کہ رابرٹ گینگ وار میں مارا گیا۔ اور ملڈریڈ کا شوہر اسے خوش نہیں رکھ سکا۔ وہ ذہنی تناؤ میں مبتلا ہے اور امید سے بھی ہے۔ فوراً ہی ظفر کو آخری ملاقات یاد آئی۔ اُس نے سوچا شاید اُسی لمحے کی خاطر مِل نے وعدہ لیا ہو۔ لیکن فوراً ہی اسے یاد آیا کہ اُس نے کہا تھا۔

"جب بھی میں تمھیں بلاؤں گی۔ تم میری مدد کو آؤ گے"

گھر پہنچ کر اُس نے شمیم کو صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ وہ بھی افسردہ سی ہوگئی۔ کئی برسوں بعد ایک دن اسپی کا ٹیلی گرام اس کی بیوی نے اس کی طرف بڑھا دیا۔ ملڈریڈ بیوہ ہوگئی۔

"اسے آج میری ضرورت ہوگی۔ اس نے بیوی سے کہا"

"لیکن انھوں نے تو کہا تھا ....."

"ہاں ..... کہا تو تھا۔"

دوسرے روز اُس نے ملڈریڈ کو خط لکھ کر تعزیت پیش کی۔ ایک دو روز بعد اُس نے اس کی ماں کے گھر پہنچ کر دلی رنج کا اظہار کیا۔ بوڑھی اسپی بھیگی آنکھوں سے اسے دیکھتی رہی۔

دن جیٹ کی رفتار سے گزرتے جا رہے تھے۔ اور وہ خود اپنے بچوں کے بہتر مستقبل کے لیے جدّوجہد میں مصروف ہو کر رہ گیا تھا۔ دفتر، گھر، گھر اور دفتر۔ بس زندگی انہی دو نقطوں کے درمیان فاصلے کا نام ٹھہری تھی۔ اور اسے وہ پابندی سے طے کر رہا تھا۔ اپنے اور ملڈریڈ کے مشترک دوست کے ذریعہ برسوں بعد اسے علم ہوا کہ ملڈریڈ کا لڑکا ڈرگ کا عادی ہوگیا ہے۔ اپنے بیٹے کی بداعمالیوں سے عاجز ہو کر وہ اپنی بچی کو لے کر کوسٹہ چلی گئی ہے۔ پھر چند مہینے بعد اسی دوست نے بتایا تھا کہ ملڈریڈ کا لڑکا بھی ختم ہوا۔ ایک مرتبہ پھر ذہن نے سوچا شاید اس وقت اُسے میری ضرورت محسوس ہو رہی ہو۔ نوجوان بیٹے کی موت دل میں سوراخ کر دیا کرتی ہے، کوسٹہ میں کون ہے جو اُس کے دُکھ تقسیم کرے گا۔ چھے ایک مہینے بعد اُسی دوست نے اس کی ماں کے اُٹھ جانے کی اطلاع دی۔ اور آہستہ سے اُس سے مخاطب ہوا۔

"تم لوگ تو چار شادیاں کر سکتے ہو۔ آج کوئی رکاوٹ تمھارے بیچ نہیں رہی"

"ٹھیک کہہ رہے ہو تم۔ لیکن میں اس عمر میں اس سے شادی نہیں کر سکتا"

"کیوں۔ کیا تم اس سے محبت نہیں کرتے"

"بالکل کرتا ہوں"

"پھر"

"میری لڑکی جوان ہو چکی ہے"

اوہ ۔ ہاں

نکہت کی شادی میں وہ خود تو نہیں آئی تھی ۔ البتہ اسی مشترکہ دوست کے ذریعہ اس نے ایک خوب صورت نیکلس ضرور بھیجا تھا ۔ اور ہزاروں نیک خواہشات .....

"کہاں ـــــ پہنچ گئے ظفر"

ملڈریڈ کے مخاطب کرنے پر وہ چونکا ۔ اُس نے آس پاس سرسری نگاہ ڈالی ۔ دائیں بائیں شمیم اور افی کب آ بیٹھے تھے اُس کا احساس ہی اسے نہ ہو سکا تھا ۔

"ماضی کے خزانے میں سے یادوں کے موتی اٹھا رہے تھے ۔

شمیم نے مسکراتے ہوئے ملڈریڈ کو جواب دیا ۔ ملڈریڈ نے حسرت بھرے انداز میں دونوں کو دیکھا ۔ پھر ایک ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے بولی

"ہسبینڈ اور وائف کا تو خدا کا سیمبل ہے ۔

"کیا ـــ ظفر نے چونک کر اُس سے پوچھا

"ہاں ظفر ـــ

"یہ تم ـــ اس طرح کی باتیں کب سے کرنے لگی ہو ؟

"ڈیپرائویشن DEPRIVATION آدمی کو بہت کچھ سکھاتا ہے ظفر

"ہٹاؤ ان باتوں کو ـــ اور یہ بتاؤ ـــ تم نے ..... ہمیں کیوں بلایا ؟

"یاد ہے ۔ میں نے تم سے وعدہ لیا تھا

"ہاں ۔ یاد ہے !

"یہ ..... ایڈنا ہے ۔ میری بیٹی ۔ میں کیا چاہتی تھی ۔ تم جانتے ہو ۔ اب تو .... یہ بھی جانتی ہیں ۔ اُس نے شمیم کی طرف اشارہ کیا پھر مسکراتے ہوئے بولی

"مگر ۔ میرے چاہنے سے کچھ نہ ہوا ۔ رابرٹ ، اور ممی ۔ ہمارے درمیان دیوار بن گئے ۔ اب ۔ وہ دیوار نہیں رہی ظفر ـــ اور ـــ میں چاہتی ہوں میری ایڈو ..... تمہارے گھر کی ہو جائے تمہارا افی اور میری ایڈو .....

ملڈریڈ نے اپنی بات پوری نہیں کی اور سر کو قدرے بلند کرتے ہوئے سب کو دیکھا ۔ ظفر اور شمیم ہمہ تن گوش تھے ، افی کچھ کھسیایا کھسیایا سا تھا ۔ اور ایڈنا کی آنکھوں سے انکار جھلک رہا تھا

ماں بیٹی کی نگاہیں چار ہوئیں ۔ ایڈنا نے نچلا ہونٹ دانتوں سے دباتے ہوئے منہ پھیر لیا اور ملڈریڈ نے محسوس کیا

رابرٹ آج بھی زندہ ہے

ممی آج بھی زندہ ہیں

اور اس نے ایک بار پھر ظفر کو کھو دیا ہے ——————— ○

ساتھی

ہال میں داخل ہوتے ہی نجمہ نے گھر کا ماحول بدلا ہوا پایا، ورنہ آج سے پہلے جب بھی وہ باپ سے ملنے آئی تھی، گھر کو کباڑ خانہ ہی پایا تھا۔ کوئی سامان تو اسے قرینے سے رکھا ہوا ملتا، صوفوں کے تکیوں پر باپ کے کپڑے، کرٹن کے کناروں پہ جمی دھول، ٹیلی وژن کی بالائی سطح پر گرد، قمیضوں کے بٹن ندارد، پتلونوں کی سلائی ادھر ادھر سے ادھڑی ہوئی، بیڈ روم اور کچن کا حال اور بھی برا، تکیوں پر تیل کے دھبے اور باپ کی گردن کا میل، چادریں میلی کچیلی، غرض قرینے سے کوئی سامان اسے گھر میں نظر نہ آتا۔ بکھری بکھری ان اشیاء پر نظر پڑتے ہی اسے اپنے دونوں بھائیوں پر غصہ آنے لگتا، جب وہ اپنی حدوں سے گزرتا تو اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلتے۔ باپ کے لیے دل میں بے پناہ ہمدردی کا جذبہ امڈتا، بھیگی آنکھوں سے باپ پر ایک نگاہ ڈالنے کے بعد وہ کمرے کے گرد دوپٹہ لپیٹتی اور گھر سنوارنے میں جٹ جاتی، باپ کچھ لمحوں تک تو اسے غور سے دیکھتا پھر ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے اس سے کہتا

"رہنے دے نجمہ ..... تو، مجھ سے ملنے آتی ہے یا .....

"بس پاپا۔ ایک منٹ۔ میں ایک منٹ میں سب ٹھیک کر دوں گی پھر ..... پھر آپ کو چائے پلاؤں گی۔ چائے ..... لبریز اور لب سوز

لبریز اور لب سوز کی ادائیگی کے لمحاتی وقفہ میں باپ اور بیٹی کی نگاہیں ضرور ملا کرتی تھیں اور فوراً ہی دونوں کو کچھ یاد بھی آجایا کرتا تھا، نجمہ محسوس کرتی وہ مئی کی جھلستی دھوپ میں کھڑی ہے اور اس کا باپ اپنے گھٹنوں میں شدید درد محسوس کرنے لگتا۔ نگاہوں کے اس لمحاتی تصادم کے بعد دونوں ہی کے آنکھوں سے گنگا جمنا بہہ نکلتی۔ باپ سر جھکائے صوفے کی طرف بڑھ جاتا اور نجمہ

کچن میں کھٹر پٹر شروع کر دیتی۔ شکر اور چائے کی برنیاں، چمچے، فرائی پان، سنے ہوئے برتن، اس کے ہاتھ مشینی انداز میں چلتے، وِم سے برتنوں اور واش بیسن کو چمکانے کے بعد وہ چولہے پر چائے کا پانی چڑھا دیتی، کڈکی پڑتے پانی کے ساتھ خود بھی کھولتی ...... اور پھر دو منٹ بعد وہ باپ کے سامنے چائے کی ٹرے لیے کھڑی ہوتی۔ لبوں پر ایک مجروح تبسم سجائے۔

"چائے ...... پاپا۔ لبریز اور لب سوز

اس تبدیلی پر بھی وہ حیران ہوئی، آج لبریز اور لب سوز کے درمیانی وقفے میں اس کے من میں تو یقیناً اتھل پتھل ہوئی تھی لیکن باپ کا رویہ آج بدلا ہوا تھا۔ بس ــ ایک پل کے لیے باپ کی آنکھوں میں اس نے کسی سائے کو لہراتے ہوئے دیکھا تھا۔ اور اس کے بعد اس نے باپ کی آواز سنی تھی۔

"بیٹھو

باپ کے سامنے صوفے پر بیٹھنے کے بعد گرم گرم چائے کی پیالی ہونٹوں کی طرف بڑھاتے ہوئے اس نے کہا

"شاکر اور طاہر ....

بات پوری نہ ہو سکی کہ گرم چائے سے اس کے ہونٹ جل اٹھے تھے۔ اس نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے باپ کی طرف دیکھا وہ بڑے غور سے اسی کو دیکھ رہا تھا۔ اُس نے دوبارہ باپ کی آنکھوں میں جھانکا، شاید وہ اسی سائے کی تلاش کر رہی تھی جو پل بھر پہلے اسے نظر آیا تھا پر اب ...... اب تو وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ بس وہ اُسے دیکھ رہا تھا، وہ دیکھتا رہا۔ پھر اس کے شوہر کی خیریت دریافت کرتے ہوئے وہ اپنے نواسے کو گدگدانے لگا۔

"وہ ...... دونوں بھی ...... آنے والے ہیں۔

"ہوں ــ باپ نے نواسے پر سے نظریں ہٹا کر اسے دیکھا اور صوفے پر کچھ اور پھیل گیا

"پاپا ...... میں ...... میں کچھ ......

اس نے اپنا مدعا بیان کرنے کی کوشش کی لیکن فوراً ہی آپسی رشتے کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے اس نے ارادہ بدل دیا

"کچھ پوچھنا چاہتی ہو؟

باپ نے سوال کیا تھا۔ یا لوہے کی گرم سلائی اس کے کانوں میں اتار دی تھی۔ وہ فیصلہ نہ کر سکی، ذہن

کے کونے کھدروں میں بھائیوں، بھاوجوں اور چھوٹی بہن کا وجود کن کھجورے کی طرح کلبلانے لگا۔ ایک بار پھر اسے اپنے بھائی، بہن اور بھاوجوں پر غصہ آیا۔ ان ہی کے اصرار پر تو وہ آج میکے آئی تھی۔

دو روز پہلے جب اس کے دونوں بھائی اور چھوٹی بہن اس کے گھر اکٹھے ہوئے تھے اور بھائی بھاوجوں نے اسے نئی صورت حال سے آگاہ کیا تھا تب بلا تاخیر اس نے بھائیوں کو بے نقط سنائی تھی، اس نے صاف طور سے جتا دیا تھا کہ اس نئی صورت حال کی تمام تر ذمّہ داری تم ہی لوگوں پر عاید ہوتی ہے، پہلے تو سب سر جھکائے بڑی بہن کی لتاڑ سنتے رہے پھر دفاع کی کوشش شاکر کی بیوی نے کی تھی۔

"آپ سمجھنے کی کوشش کریں باجی! .... اب زمانہ بدل گیا ہے

"کیا بدلا ہے؟ اُس نے چبھتے ہوئے انداز میں فورًا پوچھا تھا۔ "یہ زمین۔ وہ آسمان۔ میں۔ سلمٰی۔ پاپا۔ کیا بدلا ہے؟

"مگر

"کچھ نہیں بدلا۔ بدلا ہے تو یہ خبیث۔ اور اسے۔ تم نے بدلا ہے۔ سُن رہی ہو نا۔

"باجی۔ تم تو۔ بات کا بتنگڑ بنا رہی ہو

چھوٹی بہن سلمٰی نے بات کا رخ بدلنے کی خاطر مداخلت کی تھی تو نجمہ نے اسے بھی لتاڑا تھا

"چپ رہ۔ آج ان سوروں کی وکالت کر رہی ہے۔ تب سُن من سی دیکھا کرتی تھی۔ کیوں؟

سلمٰی سہم کر چپ ہو گئی تھی۔ ایک کے بعد ایک کئی مناظر اس کی آنکھوں میں گھوم گئے تھے۔ ماں کا جنازہ، طاہر کا دڑوکنا، پھر باپ کا اسے سنبھالنا، اس کا گڈولنا پکڑ کر چلنا، نجمہ کے رشتوں کی آمد۔ اور اس پر نجمہ کا باپ سے الجھنا .....

"نہیں کرنی مجھے شادی۔ ابھی ..... چھوٹا ہے ہی کتنا سا؟ اس کی دیکھ ریکھ کون کرے گا؟

"میں کروں گا بیٹی

"آپ اکیلے کیا کیا کریں گے پاپا۔ نہیں ابھی نہیں پاپا۔ دو چار سال اور رک جائیں۔ پہلے شاکر کا بیاہ ہوگا۔ اس کی دلہن گھر سنبھال لے گی۔ تب ..... تب کچھ سوچئے گا

وقت کا گھوڑا دلکی چلتے تھوڑی دور ہی تو گیا تھا کہ بھابھی جان آگئی تھیں۔ اور ان کی وجہ سے بہت جلد ہی گھر کی فضا مسموم ہو گئی تھی۔ اور۔ ایک روز بھابھی جان، بھائی جان کو اپنے گھر لے گئی تھیں۔

"ٹھیک ہے باجی ۔ ان کی غلطی تھی۔ لیکن اب پاپا کو اس عمر میں شادی ..... میرا مطلب ہے کچھ .....

" ان کی شادی کرنے پر ہمیں کوئی اعتراض نہیں ۔ طاہر نے پہلی مرتبہ گفتگو میں حصّہ لیا۔

" سنا ہے انہوں نے کم سن لڑکی سے شادی کی ہے۔ شاکر نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر نجمہ کے چہرے پر نظریں مرکوز کر دیں ، اس انکشاف پر نجمہ کے چہرے کے نقوش بدلے ہی تھے کہ شاکر کی بیوی نے منہ کھولا۔

" یہ عُمر اور کم سن لڑکی

" تم اپنی زبان بند رکھو ۔ نجمہ اس پر بھڑک اٹھی ، چند لمحے قہر آلود نظروں سے اسے گھورنے کے بعد زہریلے انداز میں اس سے مخاطب ہوئی۔

" اس بڑھاپے میں انہیں شادی کرنے پر کس نے مجبور کیا ؟ تم نے ۔ نہ تم اسے الگ رہنے پر اکساتیں نہ یہ سور تمہارے بہکاوے میں آتا اور نہ پاپا تنہا ہوتے ..... میں .... میں جاتی رہی ہوں وہاں ..... کیسا اجاڑ اجاڑ سا لگتا تھا وہ گھر اور اب ..... تم سب پاپا کے خلاف ایک محاذ قائم کر رہے ہو۔

" میں ایک بات پوچھوں باجی ؟

" ہاں پوچھو

بیٹی سے نظریں چراتے ہوئے باپ نے آہستگی سے کہا۔ اور اس سے پہلے کہ نجمہ کچھ معلوم کرتی ، دروازہ پر دستک ہوئی وہ صوفہ سے اٹھی ، دروازہ کھولا ۔ دروازے کے اس پار اس کے بھائی بہن اور بھاوجیں موجود تھیں ، سلام و دعا کے بعد انہوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں نجمہ سے باتیں کریں ، پھر نگاہیں نیچی کئے باپ کے سامنے جا بیٹھے ۔ باپ نے سب کی خیریت دریافت کی۔

" سب ٹھیک ہیں پاپا ..... آپ

" میں ..... باپ نے نواسے پر سے نگاہیں ہٹا کر سب کو دیکھا۔ سلمیٰ اور نجمہ کے علاوہ سب کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔

" تم ..... نجمہ تم کچھ .....

نجمہ گڑبڑا گئی، اس کی سمجھ ہی میں نہ آیا کہ وہ باپ سے کس طرح پوچھے کہ اس نے شادی کیوں کی؟ کی۔ تو کم سن لڑکی کا انتخاب کیوں کیا؟ وہ تو اچھی طرح جانتی تھی کہ اس کے پاپا شاکر اور اس کی بیوی کے چلے جانے کے بعد ایک دم سے بجھ گئے تھے۔ انہیں دیکھ کر بے اختیار ہولڈر میں لگا ہوا وہ بلب اسے یاد آنے لگتا۔ جس کے تار ٹوٹ جاتے ہیں۔ بظاہر سالم نظر آنے والا بلب۔ ہلانے ڈلانے سے اتفاقاً تار ملتے ہیں تو روشنی ہو جاتی ہے اور ہوا کا اک ذرا سا جھونکا تاروں کو پھر جدا کر دیتا ہے۔ باپ کے چہرے پر مسکان کی روشنی اس کے اور سلمیٰ کے دم سے تھی۔ اس وقت بھی اسے بے اختیار ہولڈر میں ٹنگے بلب کی یاد آگئی۔ لیکن وہ محسوس کر رہی تھی کہ تار ابھی نہیں ملے ..... آخر ..... آخر وہ کس طرح پوچھے؟ شاکر، طاہر، یا ان کی بیویوں میں اتنی جرأت کہاں تھی کہ وہ پوچھتے کیوں کہ یہ مسئلہ تو ان ہی کی وجہ سے پیدا ہوا تھا۔

"آپ

شاکر نے صوفے پر پہلو بدلتے ہوئے اور نظریں چراتے ہوئے ہمت بٹورنے کے بعد پوچھا۔

"سنا ہے آپ نے ..... شادی کر لی۔ جواب میں خاموشی پا کر سب ہی نے کنکھیوں سے باپ کو دیکھا وہ شاکر کو دیکھ رہا تھا۔

"ہم نے یہ بھی سنا ہے کہ ..... آپ نے ..... کسی کم سن .....

اس مرتبہ باپ نے نجمہ کی طرف دیکھا۔ دونوں کی نگاہیں ملیں۔ نجمہ نے دیکھا اس کے پاپا مسکرا رہے تھے۔ چند لمحوں تک وہ مسکراتے رہے پھر اپنے نواسے کے کلّے تھپتھپانے لگے۔ پل بھر میں نجمہ نے ایک فیصلہ کیا اور شاکر سے بولی

"اس گھر سے باہر نکلتے ہی تمہاری مت ماری گئی ہے

باپ پھر مسکرایا تھا اور اس بار اس نے نواسے کو گدگدا بھی دیا تھا۔ نواسہ کھل کر ہنسا تو سب نے نین جھروکوں سے نانا اور نواسے کو دیکھا

"نجمہ ..... انہیں چار پلاؤ بیٹی۔ لب ریز اور لب سوز

کافی دیر بعد باپ کی آواز ہال میں گونجی، سلمیٰ نے بہن کی طرف دیکھا، اس کی آنکھیں ڈبڈبانے لگی تھیں، اس سے پہلے کہ اس کی آنکھیں چھلک اٹھیں وہ اٹھ کر کچن کی طرف بڑھ گئی۔ شاکر، طاہر اور ان کی بیویوں نے اسے کچن کی طرف جاتے ہوئے دیکھا اور سر جھکا کر غور و فکر کی گلیوں میں کھو گئے

وہ چاروں ہی اپنے میں اخلاقی جرأت کی شدید کمی محسوس کر رہے تھے اور یہ احساس محض اس

جرم کے ردعمل کی دین تھا جو ذاتی مفاد کی خاطر ان سے سرزد ہوا تھا۔ اپنے اپنے طور پر جینے کی خواہش اب انہیں بے مطلب اور محبوس سی لگ رہی تھی۔ چونکہ وہ انفرادی طور پر ایسی صورتحال سے دوچار ہونے کی امید نہیں کرتے تھے لہٰذا اپنی الگ تھلگ دنیائیں آباد کرنے کی آرزو میں انہوں نے اس ہستی کو، اس کی تنہائی اور تنہائی سے پیدا ہونے والے مسائل کو فراموش کر دیا تھا۔ اور آج وہ اسی کے سامنے سر جھکائے بیٹھے تھے۔ بس نجمہ اور سلمیٰ ندامت کے احساس سے مبرا تھیں۔ کیونکہ گھر کے بکھرے ہوئے شیرازے کی ذمہ دار وہ نہیں تھیں۔

شاکر، طاہر اور ان کی بیویوں نے ایک دوسرے کو بھرپور جھرکوں سے دیکھا اور اس کے بعد نجمہ کو اپنی نظروں کا مرکز بنا کر سب اسے دیکھنے لگے۔ سامنے صوفے پر خاموشی کا قفل اپنے ہونٹوں پر ڈالے ان کا باپ اپنے لڑکوں اور ان کی دلہنوں کو دیکھ رہا تھا۔ سب ہی اپنے اپنے طور پر سوچ وچار میں کھوئے ہوئے تھے کہ چپلوں کی کھٹ پٹ کی آواز ان سب نے سنی۔ سب سے پہلے نجمہ نے پلٹ کر دروازے کی طرف دیکھا، اس کے بعد شاکر و طاہر نے اور آخر میں بہوؤں نے۔ دروازے کے درمیان ایک ضعیفہ کھڑی تھیں۔ اپنا پوپلا سا منھ کھولے۔ ان کے باپ سے بھی رہا نہ گیا کچھ سوا

" آؤ - آؤ - رُک کیوں گئیں ؟ دیکھ تو ..... کون کون آیا ہے

بہت دنوں بعد نجمہ نے باپ کی آواز میں زندگی کی رمق محسوس کی۔ اپنے پاپا کا یہ لہجہ بہت پہلے اُس نے سنا تھا۔

" اوہ ـ نجمہ بٹیا ہے۔ شاکر اور طاہر میاں ہیں اور ..... اور ان کی دلہنیں بھی

ضعیفہ نے ہاتھوں میں موجود تھیلیاں زمین پر رکھنے کے بعد قدم بڑھاتے ہوئے مسرت آمیز لہجے میں کہا۔ دوسرے ہی پل وہ نجمہ کے سامنے کھڑی تھیں۔ دونوں کی نظریں ملیں تو نجمہ غیرارادی طور پر اٹھ کھڑی ہوئی، ضعیفہ کے ہونٹوں پہ گہری مسکراہٹ اور دانتوں سے محروم ان کے مسوڑھوں پر نگاہ پڑتے ہی اُس کے دل میں ہلچل مچی، اپنے آپ پر قابو پانے کی اُس نے بھرپور کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکی، پہلے وہ سسکی لینے لگی پھر بے اختیار ضعیفہ سے لپٹ کر رونے لگی۔ ضعیفہ نے ایک ہاتھ سے اس کی کمر تھپ تھپاتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے اس کے آنسو پونچھے تب نجمہ کی نگاہ باپ کے چہرے پر پڑی۔

اس نے عرصہ بعد باپ کے چہرے پر زندگی سے معمور مسکراہٹ کو رقصاں دیکھا تو بے ساختہ اسے ہولڈر میں ٹنگا وہ بلب یاد آ گیا۔ جس کے تار ٹوٹ چکے تھے لیکن اب جڑے ہوئے سے نظر آ رہے تھے۔ ———— ○

ھونی

"تم جاؤ۔ اب تو باؤ جی کی طبعیت بھی سنبھل گئی ہے، پھر ڈاکٹر نے بھی کہہ دیا ہے۔ کوئی خطرہ نہیں اُسے دیور کا جانا یاد آیا، پھوجی کی رخصت یاد آئی، کاکا کی روانگی۔ یہ سب ابھی تو گئے ہیں۔ دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔ اب .....

بھائی اور بہن ساتھ آئے تھے، دونوں نے ایک ایک نظر بھائی کی جوان اور بیوہ بہو پر ڈالی تھی اور فوراً بائیں طرف راہداری میں مڑ گئے تھے۔ چھوٹی سی راہداری کے اختتام پر، کمرے میں سنگل بیڈ کے اوپر ان کا بڑا بھائی، بے حس و حرکت پڑا تھا۔ بس۔ سانسوں کے زیر و بم سے زندگی ہویدا تھی۔

"باؤ جی کو ڈاکٹروں نے جواب دے دیا ہے۔ زیادہ سے زیادہ .... بس .... بس آپ آجائیں فوراً ..... دونوں نے بس ایک پل توقف کیا تھا، پھر ایکدوسرے کو دیکھا اور اس کے بعد ساتھ ہی کمرے میں داخل ہو گئے، بہن نے سرہانے پہنچ کر بھائی کا سر اٹھایا۔ اپنی ران پر رکھا اور بھائی کے گال پر منہ رکھ کر زار زار رونے لگی۔ چھوٹے بھائی نے پائنتی کی پٹی سنبھالی۔ اور بھائی کے تلوے سہلانے لگا۔، کافی دیر بعد تلوے سہلاتے ہوئے اُسے جوان بیوہ بہو اور چھوٹے چھوٹے بچوں کا خیال آیا، جنہیں وہ ہال میں چھوڑ آیا تھا۔ اُس نے سر گھما کر دیکھا، تینوں بچے اپنی ماں کے ساتھ دروازے پر کھڑے تھے

"وہاں کیوں کھڑے ہو۔ آؤ۔ اندر آؤ"

بھائی کی آواز سن کر بہن نے ہچکیوں پر قابو پاتے ہوئے سر اٹھا کر دروازہ کی طرف دیکھا، پھر بانہیں پھیلا دیں۔ بہو دوڑ کر پھوپھیا ساس سے لپٹ گئی اور بچے چھوٹے دادا کے چرنوں میں جا بیٹھے۔

ان کے کانوں میں اپنی ماں اور ڈیڈی کی پھوجی کے رونے کی آوازیں آرہی تھیں۔ لیکن ان کے دل چھوٹے دادا کے آجانے سے قدرے مطمئن ہو چلے تھے۔ ورنہ ایک روز پہلے جب دادا اسپتال سے ڈسچارج کیے گئے تھے تو سب ہی گھبرائے ہوئے تھے۔

ببلو، ببلی، پپی اور ان کی ممّی۔

بچّوں کی ماں نے کئی جگہ فون لگائے تھے۔ واقف کاروں کو مطلع کیا۔ ڈاکٹر جواب دے چکے ہیں۔ بیس دنوں سے سکتہ کے عالم میں ہیں۔ میں انہیں آج ہی گھر لائی ہوں۔ آپ آئیں۔ میں اکیلی ہوں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔ کیا ہوگا۔ کیسے ہوگا؟

بہت ہی نازک صورت حال تھی۔ ابھی تو جی بھر کر اپنے پتی کو بھی نہ رو پائی تھی کہ ڈاکٹروں نے اسے صاف جواب دے دیا۔ دیور ملک سے باہر، انجان دیس میں، رشتے دار، سب دور۔ کوئی بھی تو پاس نہ تھا۔ نہ اس کے پتی کے دوست۔ نہ باؤجی کے۔

کس دنیا میں جی رہے ہیں ہم؟ اندھیرے اور اجالے کی دنیا میں۔ سب اجالوں کے ساتھی ہیں اندھیری انڈسٹری۔ کالے فیتے، کالا روپیہ، اور اس سے حاصل ہونے والا اجالا۔ جب تک روشنی ہے سب ساتھ اور اب ..... مگر باؤجی کی ایک دنیا اور بھی تو تھی اور — اس دنیا کا ایک باسی۔ بس ایک باسی باؤجی کے ساتھ ہے۔

"تم روتی رہوگی تو بچّوں پر برا اثر پڑے گا۔ ان کے بھائی بہن کو اطلاع دے دو۔ بیٹے کو ٹرنک کال کردو مجھے اُمید ہے۔ وہ ان کی زندگی میں پہنچ جائیں گے۔

اسی دوست کے کہنے پر بیوہ بہو نے سب سے پہلے دہلی فون کیا تھا۔ پھر گھنٹہ بھر بعد وہ دیور سے کہہ رہی تھی۔

"ہاں بھیا۔ تو فوراً چل پڑ۔ شاید جیوت باؤجی کے چرن چھونے کو مل جائیں"

کوئی گھنٹہ بھر بعد دوبارہ بیل بجی، ملازم نے دروازہ کھولا۔ باؤجی کا چھوٹا بیٹا اٹیچی لئے کھڑا تھا۔ ملازم نے چھوٹے مالک کو دیکھا اور بے اختیار اسے لپٹا لیا۔ پھر روتے ہوئے اُس سے بولا۔

"تو — زندگی میں ہی آگیا پُتّر!"

دوسرے ہی پل ایک ہلکا سا اطمینان بیٹے کے چہرے پر نظر آیا۔ بچّوں نے کاکا کو دیکھا تو دوڑ کر کاکا سے لپٹ لپٹ گئے۔ وہ ہنس بھی رہے تھے، رو بھی رہے تھے۔ بچّوں کی آواز پر کچن سے ان کی ماں نکلی۔ دیور پر نظر پڑتے ہی دوڑ کر اس سے لپٹ گئی پھر زار و قطار رونے لگی سب کو تھوڑی سی

تسلّیاں ، تھوڑے دلاسے دینے کے بعد وہ باؤجی کے کمرے کی طرف بڑھا۔ باؤجی کے کمرے کا ماحول بڑا ہی روح فرسا تھا۔ پھوجی باؤجی کا سر زانو پر لیے ان کے سرہانے بیٹھی تھیں ۔ کاکا پائنتی اور باؤجی کے دوست فرش پر بیٹھے تھے۔ اپنے دوست کا داہنا ہاتھ دونوں ہاتھوں میں لیے ۔ اُس نے آگے بڑھ کر کاکا کے چرن چھوے ، پھر پھوجی کے ۔ باؤجی کے دوست کو پرنام کیا ۔ اور باؤجی کو دیکھنے لگا ۔ ان کی آنکھیں کھُلی ہوئی تھیں ۔ سانسیں معمول کے مطابق چل رہی تھیں ۔ لیکن باؤجی کہاں تھے ؟

کھانے کی میز پر پھوجی کے علاوہ سب ہی تھے ۔ اور سب کے سب خاموشی کا ایک حصّہ بنے ہوئے تھے ۔

" ڈاکٹر نے کیا کہا ؟

کاکا کے پوچھنے پر سکوت ٹوٹا ۔ دیور کی نظریں بھی بھابھی کی طرف اٹھ گئیں ۔

" کوئی بیس دن اسپتال رہے ۔ اسی عالم میں ۔ جس میں آپ دیکھ چکے ۔ کل انہوں نے بھی ڈسچارج کر دیا ۔ کہ زیادہ سے زیادہ .....

اس سے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکی ۔ ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے تھے ۔ ماں کو روتے دیکھ کر بچّے بھی سسکنے لگے تھے ۔

" چا ..... چار..... روز

ملازم نے بہو کی بات پوری کی ۔ اور خود بھی انگوچھے سے آنسو پونچھنے لگا ۔ کاکا نے سب کو غور سے دیکھا۔ بھائی کی جوان بہو رو رہی تھی ۔ بچّے اب ہچکیاں لے رہے تھے اور بھتیجہ گم صم بیٹھا تھا ۔

" ہمّت سے کام لو تم سب ۔ واہگرو کرپا کریں گے ۔ ہونی ..... تو ..... ہو کے رہے گی ۔

" کاکا ۔ جوان جہان بیٹا ضبط نہ کر سکا ۔ انہوں نے کرسی چھوڑی ، بھتیجے کو گلے سے لگا کر ڈھارس بندھائی اور بولے

" دعا کر بیٹے ۔ پراجی ہوش میں آجائیں ۔ بس ۔ ایک بار دیکھیں ۔ سب ہی ان کے پاس ہیں ۔

پھر انہوں نے دیکھا ۔ سب ہی کے ہاتھ رکے ہوئے تھے ۔ انہوں نے ملازم کو اشارہ کیا ۔ اُدھر اُس نے سب کے سامنے رکھے ہوئے گلاس میں پانی بھرا ۔ اِدھر انہوں نے ایک فیصلہ کیا ۔ بڑے ٹھہرے ٹھہرے انداز میں انہوں نے کہنا شروع کیا ۔

" میں بھول ہی نہیں سکتا اس گھڑی کو ۔ جب پاپاجی کا دیہانت ہوا تھا ۔ ہم سب چھوٹے

سے تھے۔ بہت ہی چھوٹے، ماں تھیں۔ سدا کی بیمار۔ میں۔ پپّی جیسا تھا۔ تمہاری پھوجی۔ ببلی سے بھی چھوٹی تھی ..... پراجی .... پراجی کی نئی نئی نوکری لگی تھی۔ ڈاک خانے میں ... روز .... روز ڈیوٹی پر جانے سے پہلے پراجی۔ مجھے اور تمہاری پھوجی کو اپنے ہاتھوں نہلاتے کپڑے بدلواتے۔ ماں کے سنگ ہمارے لیے ناشتہ بناتے اور پھر۔ ہمیں اسکول چھوڑ کر ہی ..... اور اس کے بعد خود ان کی آواز بھی بھرا گئی۔ انہوں نے آگے بڑھ کر پانی کا گلاس اٹھایا۔ اور ہونٹوں سے لگالیا۔ سب کے کہنے سننے پر باؤجی کی بہن نے بھی دو چار نوالے کھائے۔ پھر سب ہی باؤجی کے پاس پہنچ گئے۔

دوسرے دن کاکا اور چھوٹے دادا کے کہنے پر بیوہ بہو نے اپنے بچوں کو اسکول بھیجا۔ گھر پر وہی جان لیوا خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ سب ہی ہونی کے منتظر تھے۔ ڈاکٹروں کے بیان کے مطابق باؤجی کو زیادہ سے زیادہ دو روز اور زندہ رہنا تھا۔ بہو کچن میں ملازم کا ہاتھ بٹا رہی تھی۔ لیکن اس کا ذہن سسر کی طرف تھا۔ اسے وہ باتیں یاد آرہی تھیں۔ جو اس کے سسر نے اس کے پتی۔ یعنی اپنے بیٹے سے کی تھیں۔ باپ بیٹے کی سوچ میں ایک نمایاں فرق تھا۔ بیٹا زندگی میں تیزی کا قائل تھا اور باپ اعتدال پسند طبیعت کے مالک تھے۔

دونوں میں زندگی گزارنے کے طریقوں کو لے کر اکثر دلچسپ بحث ہوا کرتی تھی۔ اُسے یاد آیا۔

وہ سب ایک تقریب سے لوٹ رہے تھے۔ اس کا پتی کار ڈرائیو کر رہا تھا، ہمیشہ کی طرح تیز۔ باؤجی نے اسے ڈانٹا۔ گاڑی رکوائی۔ پھر خود ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر اوسط رفتار سے گاڑی چلانے لگے تھے۔

"تم اتنی تیز ڈرائیونگ کرتے ہو۔ کبھی بھی حادثہ ہو سکتا ہے۔

"وہ تو سلو ڈرائیونگ میں بھی ہو سکتا ہے۔ باؤجی

"بحث کرنا تمہاری عادت ہے۔

"آپ بھی تو .....

شوہر کی بات ادھوری رہ گئی تھی۔ کیوں کہ اس کے سسر نے کار کو بریک لگائے تھے۔ انہوں نے دیکھا۔ ایک بکری روڈ کراس کر رہی تھی۔ اور اُسے بچانے کی خاطر باؤجی نے کار کی رفتار کم کر دی تھی۔

"اگر تم میری جگہ ہوتے تو یہ بکری مر جاتی

"کبھی نہیں

"کیسے

"میں اب تلک اگلا سگنل کراس کر گیا ہوتا۔

ملازم نے پوری تیل میں ڈالی تھی۔ اور کڑھائی کا کھولتا ہوا تیل سن سنا کر چھوٹے چھوٹے بلبلوں کی صورت ابھر ابھر کر پھوٹ رہا تھا۔ بہو نے سوچا۔ سچ مچ انہوں نے سگنل کراس کیا۔ اس روز مفلوج سسر نے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا تھا۔

"میں نے جو کھویا ہے۔ جانتا ہوں۔ تو نے کیا کھویا ہے۔ تو بھی جانتی ہے۔ پر بچے نہیں جانتے۔ انہوں نے کیا کچھ کھو دیا ہے۔

ایک ہی دنیا کے تو باسی تھے دونوں۔ اُن کے آخری سفر پر کتنی بھیڑ تھی۔ بھیڑ تو ان کے دوستوں کی بھی ہوا کرتی تھی۔ پر جب سے مفلوج ہوئے ہیں۔ انقلاب آگیا ہے۔ کوئی بھی نہیں آتا۔ سوائے اس اکلوتے دوست کے۔ جس کا اندھیروں کی دنیا سے کوئی سمبندھ نہیں۔ لیکن باؤجی۔ صرف اندھیرے کے باسی تو نہ تھے۔ ان کی ایک دنیا اور بھی تو ہے۔ شبدوں کی دنیا۔ تو کیا۔ اس دنیا میں صرف یہی دو آدمی زندہ بچے ہیں؟۔ شاید وہ لوگ بھی مر چکے۔ مرے نہیں، تو انہیں اپنی موت کے آنے کا یقین نہیں ہے۔ ورنہ۔ کیا وہ باؤجی کو اس طرح اکیلا چھوڑ دیتے۔ لعنت ہے ان لوگوں پر۔

تیسرے دن کا سورج ڈوبا تو اس کے ساتھ گھر والوں کے دل بھی نا امیدی کے سمندر میں ڈوب گئے۔ سب نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایکدوسرے کو دیکھا۔ اور باؤجی کے پاس براجے رہے۔ رات سب نے آنکھوں ہی آنکھوں میں گزاری جیسے ہونی کو کھلی آنکھوں سے ہوتا ہوا دیکھ لینا چاہتے ہوں۔ چوتھے دن باؤجی کے پپوٹوں میں حرکت ہوئی۔ چھوٹے بھائی کی نگاہ پڑی تو اس کی بھیگی ہوئی آنکھوں میں خوشیوں کے جگنو چمک اٹھے۔ اس نے ہلکی سی آواز سے بہن کو متوجہ کیا۔ ادھر خود بہن بھائی کے سر کی کسمساہٹ محسوس کر رہی تھی۔ دونوں نے بہو کو ایک ساتھ پکارا۔ وہ بدحواسی کے عالم میں دوڑی دوڑی آئی اور بدلی ہوئی صورت حال کو دیکھتے ہی سسر کے قدموں پر سر رکھ کر رونے لگی۔ باؤجی کا کانپتا ہوا ہاتھ بہو کے سر پر پہنچا۔ کافی دیر تک وہ بہو کا سر سہلاتے رہے۔ پھر انہوں نے اپنے بیٹے کو دیکھا۔ دیکھتے رہے۔ کچھ دیر بعد ان کا دوست بھی آگیا۔ اور جب باؤجی کو پتہ چلا کہ ان کا دوست روز ہی آتا رہا ہے تو ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

دن بدن باؤجی کی حالت سنبھلتی جا رہی تھی۔ گھر کی رونق لوٹ آئی تھی۔ بچوں کے کمروں سے ایک بار پھر پاپ میوزک کا مدھم شور بلند ہونے لگا تھا۔ اب بہو کا چہرہ بھی کھلا کھلا سا رہنے لگا تھا۔

بہن کے چہرے پر بھی اطمینان تھا ۔ دوست اپنی دنیا کی سناتا۔ بھائی سیوا میں لگا رہتا ۔ اور بیٹا۔ بھائی اور باپ کے بقایا جات کی وصولی کی خاطر بھاگ دوڑ میں لگا رہتا ۔ ڈاکٹر حیران تھے کہ ہونی ۔ انہونی میں کیسے بدل گئی۔

" میری چھٹیاں ختم ہو رہی ہیں ۔ آپ کے کہنے پر بیس روز کی ایمرجنسی لیو ملی تھی۔

بیٹے نے باپ کی سنبھلتی ہوئی حالت کو دیکھنے کے بعد ایک روز بھابھی سے کہا تو اس نے بھی مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

" تم جاؤ ۔ اب تو ۔ باؤجی کی طبیعت بھی سنبھل گئی ہے ۔ پھر ڈاکٹر نے بھی کہدیا ہے ۔ کوئی خطرہ نہیں

پہلے بیٹا رخصت ہوا ۔ پھر بھائی ، پچیسویں دن بہن کا شوہر آکر اپنی بیوی کو لے گیا ۔ بچے حسب معمول اسکول جاتے رہے ۔ بہو اپنی مصروفیات میں روز و شب گزارنے لگی ۔ زندگی معمول کے مطابق گزر رہی تھی بس۔

یاد تھا تو اس قدر کہ چند روز پہلے موت کا فرشتہ ان کے گھر جھانک گیا تھا۔

ایک روز علی الصبح ملازم نے کواڑ تھپ تھپائے ۔ بہو نے دروازہ کھولا ۔ دیرینہ ملازم منہ لٹکائے کھڑا تھا۔

" کیا بات ہے

" باؤجی ۔ ابھی تک نہیں اٹھے

دونوں دوڑتے ہوئے ان کے کمرے میں پہنچے ۔ بہو نے فوراً ڈاکٹر کو فون کیا ۔ وہ آیا ۔ باؤجی کا معائنہ کیا ۔ اور انہیں چادر اڑھا کر خود بھی سر جھکا کر بیٹھ گیا ۔

" ڈاکٹر صاحب

" صبح ۔ کسی وقت ..... وہ ..... چلے گئے ۔ دل کی دھڑکن ....

" تم جاؤ ۔ اب تو باؤجی کی طبیعت بھی سنبھل گئی ہے ۔ پھر ڈاکٹر نے بھی کہہ دیا ہے ۔ کوئی خطرہ نہیں

اُسے دیور کا جانا یاد آیا ۔ پھوجی کی رخصت یاد آئی ۔ کاکا کی روانگی ۔ یہ سب ۔ ابھی تو گئے ہیں ۔ دن ہی کتنے ہوئے ہیں ۔ اب .... انہیں ... پھر

ایکمرتبہ پھر اس کے بائیں ہاتھ میں ریسیور تھا ۔ اور اس کے دائیں ہاتھ کی انگلی ڈائل کی طرف بڑھ رہی تھی ——————

۱۳ر اگست سنہ ۱۹۸۰ء

گنگا جمنی اینٹوں سے چنا ہوا مکان پوری طرف خوف و ہراس اور گہرے دکھ میں ڈوبا ہوا ہے۔ صحن میں دستی نل کی ہودی سے قدرے ہٹ کر ایک ادھیڑ عمر خاتون دوپٹے کو کمر پر لپیٹنے کے بعد اس کے دونوں سروں میں گرہ لگا رہی ہے، گرہ لگانے کے بعد خالی خالی نظروں سے اس نے مقابل کھڑی بڑی بیٹی کو دیکھا وہ اپنی شلوار کو نیفے میں اُڑس کر اونچا کر رہی تھی، ادھیڑ عمر عورت نے جھک کر چوڑی دار پائجامے کو ٹخنوں سے اوپر چڑھایا۔ قریب پڑے پھاوڑے کے دستے کو پکڑتے ہوئے اس نے دالان پر نگاہ ڈالی۔

دالان میں اس کی سب سے چھوٹی بچی کبھی اپنی ماں کو دیکھ رہی تھی، کبھی اپنی اپیا کو، اور کبھی زمین پر پڑی اپنے ابّو اور جوان بھائی کی لاشوں کو۔ ایک کے سینے پر گولی لگی تھی اور دوسرے کے سر میں۔ دونوں کے سفید کرتے خون میں سنے ہوئے تھے اور اب تو خون کی رنگت بھی بدل چکی تھی۔

ماں نے اپنی نگاہوں کا زاویہ تبدیل کیا۔ بڑی بیٹی کو دیکھا، آنکھوں ہی آنکھوں میں دونوں نے کچھ طے کیا، پھاوڑے والا ہاتھ بلند ہوا اور پوری قوت سے زمین کی چھاتی میں پھاوڑا دھنس گیا۔ دھپ کی آواز، دالان میں بیٹھی تینوں بہنوں نے سنی، تینوں ہی نے سہم کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ چھوٹی نے اضطرار کے عالم میں باپ کے لاشے کی پنڈلی تھام لی، سہمی سہمی نگاہ اس نے ماں پہ ڈالی جس کا پورا وجود ایک بار پھر پشت کی طرف جھکا، دونوں ہاتھ بلند ہوئے، پھاوڑا نیم کی شاخوں تک پہنچا اور دھپ کی آواز کے ساتھ ہی دور کہیں گولی چلنے کی آواز تینوں نے سنی۔ گولی چلنے کی آواز کا اثر گڑھا کھودنے والی ماں اور بیٹی پر نہیں ہوا۔ یوں لگتا تھا کہ ان کے کان قوتِ سماعت سے محروم ہو چکے ہیں۔ اور ان کی آنکھوں کے حلقوں میں اب ڈھیلے بھی نہیں رہے۔ بس۔ انہیں یاد تھا تو اتنا کہ دالان میں بچیوں کے پاس دو لاشیں پڑی ہیں۔ اور شہر میں بے مدت کرفیو لگا ہے۔ اگر لاشیں یوں ہی پڑی رہ گئیں تو تعفن کے

مارے گھر میں بیٹھا نہ جا سکے گا۔ اور گھر سے باہر نکلنے کی پاداش میں دائیں، بائیں یا کسی اونچے مکان کی چھت سے گولی چلے گی اور .....

پھاوڑے اور بیلچے نے زمین کی تہیں کھولنی شروع کر دی تھیں، پھاوڑے کی ہر ضرب خوف ناک سناٹے کی چادر کو تانتی چلی جا رہی تھی، ماں اور بیٹی بلا کے گڑھا کھود رہی تھیں، انہیں پتہ ہی نہ چلا کہ رات نے کرفیو زدہ شہر پر کب سیاہی پھیری۔ دالان میں بیٹھی تلے اوپر کی تین بہنوں میں سے ایک نے صحن میں پھیلتے اندھیرے کو محسوس کیا تو اٹھ کے اس نے باورچی خانے کا رخ کیا۔ چند لمحوں بعد وہ ڈھبری جلا رہی تھی ۔۔۔ دوسرے ہی پل گہرا زردی مائل اجالا دالان اور صحن میں پھیلنے لگا۔ لمحے بھر کی خاطر گڑھا کھودنے والی ماں اور بیٹی کے ہاتھ رکے، چہرے گھومے، دونوں نے قمیضوں کی آستینوں سے چہرے کا پسینہ پونچھا، ٹھیک اسی وقت دالان میں بیٹھی دونوں بہنوں نے ڈر کے مارے سر جھکا لئے، یہ ..... ہماری اپیا تو نہیں۔ یہ امی تو ہرگز نہیں ہیں ۔ انہوں نے سوچا ۔ یہ تو کسی اور دنیا کی عورتیں ہیں۔ امی اور اپیا کا چہرہ اتنا دہشت ناک تو نہ تھا۔

اپیا کی مٹھیوں میں دبا بیلچہ زمین میں دھنسا، مٹی کی تہہ نل کی ہودی کی طرف ڈھیر ہوئی اور ماں کا پھاوڑا پوری قوت سے زمین کی چھاتی پر پڑا۔

بس ۔ ایسا ہی ہوا ہوگا ۔ اپیا کی اپنی چھاتی میں درد کی ایک تیز لہر اٹھی۔ اُس نے ماں کا پھاوڑا زمین میں دھنسا دیکھا۔ شاید وہ کچھ اور بھی سوچتی پر بے گور و کفن باپ اور بھائی کی لاش کا خیال آتے ہی وہ چونکی۔ بیلچے کی کھچ کھچ اور پھاوڑے کی بھد بھد کے بیچ ہی ایک تیسری آواز بھی کافی دیر سے سنائی دے رہی تھی۔ دالان کی مشترکہ دیوار میں موجود کھڑکی کی کنڈی مسلسل مگر احتیاط سے بج رہی تھی۔ لیکن ماں بیٹی کے ہاتھوں کی مصروفیت اور ماحول پر مسلط خوف کی وجہ سے دالان میں بیٹھی بہنوں نے اس پر توجہ ہی نہ دی۔ اب کی مرتبہ کنڈی قدرے زور سے بجائی گئی، تب اس لڑکی نے جو کچھ دیر پہلے ڈھبری جلا چکی تھی، پہلے گڑھے کو، پھر فرش پہ پڑی لاشوں کو دیکھا اور اس کے بعد صحن میں گڑھا کھودنے میں مصروف ماں اور اپیا کو۔ گویا اُسے اُن کی اجازت مطلوب ہو۔ لیکن انہیں اپنے کام میں منہمک پا کر اُس نے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھائے، کھڑکی کے قریب پہنچی۔ اور چٹخنی گرا دی۔

کھڑکی کے اس پار ماہی کھڑی تھیں۔ اپنا غم زدہ چہرہ لئے۔ دونوں کی نظریں ملیں، ماسی نے شفقت بھرا ہاتھ بچی کے سر پر رکھا۔ داہنا پیر اٹھا کر کھڑکی کی راہ وہ پڑوس میں چلی آئیں۔ پھر بائیں ہاتھ سے سانکل پکڑے وہ جھکیں اور اپنی اور سے تسلہ اٹھا کر تیزی سے صحن کی طرف بڑھ گئیں۔

دالان میں بیٹھی سب سے چھوٹی بچی نے سامنے کی دیوار پر صحن کی طرف بڑھتی ہوئی ماسی کا سایہ دیکھا تو ڈر کر آنکھیں بند کرلیں۔ وہ کافی دیر سے ڈھبری کی زرد روشنی میں اپنے ہی سائے کو عجیب عجیب حرکتیں کرتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

بس، چند لمحوں کی خاطر بیلچے اور پھاوڑے نے زمین کی پرتیں ادھیڑنی چھوڑ دی تھیں، ماں اور بیٹی نے پڑوسن کو دیکھا دونوں کے دل پھڑ پھڑائے، اس سے پہلے کہ دونوں کے دل سے بخارات اٹھ کر آنکھوں کی راہ بہہ نکلتے ماں نے پھاوڑا سر سے بلند کیا، دھپ کی آواز آئی۔ کافی مٹی پھاوڑے پر آگئی تھی، فوراً ہی پڑوسن نے تسلہ آگے بڑھا دیا۔ اب کام بٹ گیا تھا۔ ان کی ہمتیں بلند ہوگئی تھیں، پر اندھیرا گہرا ہوتا جارہا تھا۔ چھے ہاتھ تیزی سے چل رہے تھے، ڈھبری کے زرد روشنی میں ان تینوں کے سائے غسل خانے کی دیوار پر پڑ رہے تھے۔ چھوٹی بچی کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہوچلی تھیں، اُس کی پلکیں مندتی ہی جارہی تھیں کہ ماحول کے سکوت نے اس کے ذہن کو بیدار کردیا۔ آنکھیں کھول کر اُس نے دیکھا، امی، اپیا اور ماسی کے ہاتھ رکے ہوئے ہیں۔ ماں کے ہاتھ میں ایک ہڈی ہے اور ایک ادھوری انسانی کھوپڑی مٹی کے ڈھیر پر پڑی ہوئی ہے۔ ایک گھٹی گھٹی سی چیخ اُس کے اندر سے ابھری مگر حلقوم تک آتے آتے دم توڑ گئی، کچھ لمحے بعد بچی کی پلکوں کے کواڑ پھر بند ہونے لگے تھے۔

یکبارگی دروازہ دھڑ دھڑا کر کھل گیا۔ ڈر کے مارے سب کی چیخیں بلند ہوگئیں۔ پڑوسی شرما جی کے لڑکے انیل نے بھیّا کو کندھے پر اٹھا رکھا ہے اور ابو نڈھال سے زمین پر تڑپ رہے ہیں۔

"اپیا — آؤ۔ بھائی کو ..... سنبھالو ..... عیدگاہ پر ..... بلوے میں ..... ان کے گولی لگ گئی ..... چاچا انہیں اٹھائے بھاگ رہے تھے۔ اپنی ..... گلی کے موڑ پر ..... پولس نے ..... پیچھے ..... سے ..... آؤ اپیا۔ جلدی آؤ ....."

صبح ساڑھے چھے دونوں باپ بیٹے سفید کرتے پائجامے پہن کر عیدگاہ گئے تھے۔ اور اب انیل نے اس کے ویرا کو کندھے پر سہار رکھا تھا۔ اس کے ابو خون میں لت پت پڑے تھے۔ سانسیں اکھڑ چلی تھیں، اپیا اور امی بولا کر ان کی طرف بڑھیں، جیسے تیسے انہوں نے ان دونوں کو دالان میں پہنچایا — دروازے سے دالان تک پہنچنے میں ابو نے آنکھیں بند کرلیں۔ انیل بجھے دل کے ساتھ سر جھکائے مکان سے نکلا اور ٹھیک اسی وقت گولی چلنے کی آواز انہوں نے سنی۔ کئی چیخیں انہوں نے سنیں۔ پر ایک چیخ ان سب سے بلند تھی۔ اپیا نے دروازہ بند کرتے ہوئے گلی میں تڑپتے انیل کو دیکھ لیا تھا۔

دور کہیں لاؤڈ اسپیکر پر پولس والے بے مدت کرفیو کا اعلان کر رہے تھے اور پھر ایک چیخ بلند ہوئی تھی۔

گھبرا کے وہ جاگ اٹھی، محراب کے کھولے سے لگے لگے، اُس کی آنکھ لگ گئی تھی۔ وہ اس کی اپیا کی چیخ تھی۔ جو کرفیو زدہ رات کا سینہ چیرنے کے بعد خاموشی کا ایک حصہ بن گئی، اس نے نندا سی آنکھوں سے دیکھا، اپیا، امی، ماسی، ابو اور بھیا کی لاشیں گڑھے میں اتار چکی ہیں۔ دونوں لاشیں برابر لٹانے کے بعد امی نے کمر پر بندھا دوپٹہ کھولا ہے اور لاشوں پر ڈال دیا ہے۔ اپیا نے گھڑونچی پر رکھا اپنا دوپٹہ اٹھایا۔ ماسی کی مدد سے اُسے پھیلایا اور میتیں ڈھک دیں۔

ایکم تب پھر بیلچہ اور پھاوڑا مصروف ہوا۔ اِدھر اُدھر پھیلی مٹی سے گڑھا بھر گیا۔ اپیا نے، پھر آستین سے پسینہ پونچھا گھڑونچی کے قریب پہنچیں۔ بالٹی اٹھائی۔ اور نل کی طرف بڑھنے لگی۔ ایک بچی دوڑ کر نل کے قریب پہنچی اور ہتھی چلانے لگی۔ بالٹی بھر جانے کے بعد اپیا نے باپ اور بھائی کی مشترکہ قبر پر پانی چھڑکا۔ امی نے غور سے اپنی بیٹی کو دیکھا اور نڈھال سی دالان کی طرف بڑھیں۔ لیکن وہ چند ہی قدم چلی تھیں کہ چکرا کر گر پڑیں۔ ماسی دوڑیں۔ چلو میں پانی لے کر ان کے منہ پر چھینٹے دیئے۔ امی نے آنکھیں کھول کر ماسی کو دیکھا۔ اک ذرا سا ہاتھ اٹھا کے انہیں اطمینان دلایا۔ تب ماسی نے گھٹنوں پر ہتھیلیوں کا دباؤ ڈالا۔ اٹھیں، اپنا تسلہ اٹھا کر اپیا کو حسرت بھرے انداز میں دیکھا اور پھاوڑے کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ اپیا اپنی اجڑی آنکھوں سے ماسی کو دیکھ رہی تھی۔ اُس نے دیکھا ماسی کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور وہ تھکے قدموں دالان کی مشترکہ کھڑکی کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ پل بھر میں اپیا نے ایک فیصلہ کیا۔ اپنا بیلچہ اٹھا کر وہ بھی ماسی کے پیچھے چل پڑی۔

محراب کے کھولے سے لگی بچی نے اپیا کو دوسری طرف جاتے ہوئے دیکھا۔ کچھ دیر بعد برابر کے مکان سے کھچ کھچ اور دھپ دھپ کی آوازیں آرہی تھیں۔ بچی کی پلکوں کے پٹ پھر بھڑنے لگے تھے۔ اور مندتی ہوئی پلکوں کی جھری سے وہ دیوار پر پڑتے سائے کو دیکھ رہی تھی۔ اپنے ہی سائے کو۔ جو کبھی ایک جگہ تھم جاتا۔ کبھی لہراتا اور کبھی طوفانی انداز میں اپنے ہی جیسے دوسرے سایوں پر حملہ کر بیٹھتا تھا۔ دور کہیں پھر گولی چلی تھی۔ اور ایک چیخ بھی بلند ہوئی تھی۔ ——— ○

لے (۱۳ اگست ۱۹۸۰ء کو مراد آباد میں ہندو مسلم فساد ہوا تھا)

ایرینا

انڈین ایر لائن کی ایئر بس کراچی کے رن وے پر اترنے کے بعد تیزی سے دوڑنے لگی۔ پھر اُس کی رفتار بتدریج کم ہونے لگی ہے، مسافروں نے حفاظتی پیٹیاں کھولتے ہی اپنے چھوٹے چھوٹے اسباب کی طرف ہاتھ بڑھانے شروع کر دیئے۔ پندرہ بیس منٹوں بعد ہم ایمی گریشن کی قطار میں کھڑے پہلو بدل رہے تھے۔ تقریباً پون گھنٹے کے بعد کسٹم وغیرہ سے فارغ ہوکر میں نے بعد جب وزیٹرز گیلری میں کھڑے لوگوں پر نگاہ ڈالی تو کوئی بھی شناسا چہرہ دکھائی نہ دیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ عذرا کو میرا ٹیلی گرام نہیں ملا تھا۔ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے پھر ایک مرتبہ میں نے وزیٹرز گیلری میں کھڑے افراد کو دیکھا۔ ہر چہرہ کسی نہ کسی عزیز و اقارب کی آمد کے باعث شاداب و شگفتہ تھا۔ مگر اُن مشتاقان کے کِھلے ہوئے چہروں میں میرا اپنا شناسا ایک بھی چہرہ نہ تھا۔ ایک دم سے مایوسی کے جرثوموں نے ذہن پر یلغار کی۔ عذرا نہ سہی۔ شباہت اور اجمل کو آنا چاہیئے تھا۔ ابھی مایوسی شدید ہوکر محرومی کی حدود میں داخل نہ ہوئی تھی کہ ایک قدرے موٹی سی لڑکی دوڑتے ہوئے میری طرف بڑھی اور پھوپھا جان سلام علیکم کہتے ہوئے مجھ سے لپٹ گئی۔ میں نے اُسے آواز سے پہچانا۔ یہ عذرا تھی۔ میرے منجھلے برادرِ نسبتی کی اکلوتی بیٹی۔ دو منٹ بعد ہم ٹیکسی میں بیٹھے جمشید روڈ کی طرف جا رہے تھے۔ عذرا مجھ سے لپٹی ہوئی رو رہی تھی۔ ٹیکسی ڈرائیور کے برابر والی سیٹ پر اس کا تازہ داد بھائی رفعت بیٹھا ہوا تھا۔

بھائی اعجاز کے انتقال کے بعد میں پہلی مرتبہ کراچی آیا تھا۔ اس سے پہلے ۸۳ء میں جب کراچی آیا تھا تب بھائی اعجاز بھی حیات تھے اور ان کے بڑے بھائی مشرف بھی۔ لیکن دو ڈھائی برسوں میں آگے پیچھے دونوں بھائی دنیا سے سدھارے تھے اور میں اپنی تمام تر خواہشات کے باوجود تعزیت ادا کرنے کی خاطر کراچی نہیں پہنچ سکا تھا۔ زندگی بھی ہمیں کیسے کیسے کردار ادا کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ ٹیکسی

غالباً سبزی منڈی سے گذر رہی تھی چند ہی برسوں میں کے ڈی اے نے نئی تعمیرات کا جال سا پھیلا دیا ہے۔ میں نے سڑک کے دائیں بائیں نگاہ ڈالتے ہوئے سوچا۔ ہاں تو۔ میں کہہ رہا تھا۔ زندگی بھی ..... ان مجبوریوں میں کچھ تو ہماری خود ساختہ ہوا کرتی ہیں۔ اور چند ایک کا تعلق انسانی بنیادوں سے ہوا کرتا ہے۔ لیکن بھائی مشرف کی بیوہ نے اس خط کی بنیاد پر خود ساختہ مجبوری کو ہی کیش کیا تھا۔ انہیں مجھ سے یہ شکایت تھی کہ پرسہ کا خط میں نے ان کے بیٹے محسن کے نام کیوں تحریر کیا تھا۔

ٹیکسی منزل مقصود پر پہنچی۔ پتلی سی گلی کے آخر میں کئی شناسا چہرے دکھائی دے گئے، الیاس بھائی، شاہینہ بھابھی والدہ حسن اختر اور وہ گوری چٹی معصوم سی بچی افشین ہی ہونی چاہیئے۔ الیاس بھائی اور شاہینہ بھابھی کی بیٹی۔ ان سب کے پیچھے گھر کا دروازہ پاٹوں پاٹ کھلا ہوا تھا۔ عذرا نے ٹیکسی کا کرایہ ادا کرنے کے بعد مجھ سے چلنے کو کہا۔ لیکن میرے دونوں پیر تو حرکت ہی نہیں کر رہے تھے میری آنکھوں میں اعجاز مرحوم کا چہرہ سمایا ہوا تھا۔ دبلا پتلا۔ سیتلا کے مندل ہوتے نقوش والا۔ نہ جانے۔ مکان میں کب اور کس طرح داخل ہوا۔ قدموں کی آہٹ اور عذرا کے مخاطب کرنے پر نواڑ کے پلنگ پر پیروں کو لٹکا کر بیٹھی ہوئی بالی بھابھی نے بین کرنے شروع کر دیئے

"ارے اٹھ کے آؤ تم۔ دیکھو تو تمہارا ..... آیا ہے۔ ہمارے سروں پہ ہاتھ رکھنے۔

الیاس بھائی نے آگے بڑھ کر بھابھی کو سنبھالا۔ شاہینہ بھابھی نے پانی کا گلاس بھابھی کے ہونٹوں سے لگاتے ہوئے صبر کی تلقین کی۔ پانی کے دو چار گھونٹ پینے کے بعد بھی بھابھی سبک رہی تھیں۔ میں آگے بڑھ کر پلنگ کی پٹی پر بیٹھا۔ بھابھی نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے مجھے دیکھا مجھ میں ان نگاہوں کو دیکھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ ایک دم سے میرا دل مچلنے لگا اور بھابھی کہہ کر ان سے لپٹتے ہوئے میں بھی رونے لگا۔ پھر گھر میں کہرام مچا۔ ہمیں روتا دیکھ کر عذرا بھی صبر کا دامن چھوڑ بیٹھی۔ وہ بھی میری کمر سے لپٹی دہاڑیں مارنے لگی تھی۔ کافی دیر بعد الیاس بھائی، شاہینہ بھابھی اور والدہ حسن اختر کی تسلیوں کے باعث ہم سب خاموش ہوئے۔ اسی اثنا میں افشین اپنے گھر سے تین چار گلاسوں میں شربت لے آئی تھی۔ شربت کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیتے ہوئے بھابھی بھائی اعجاز کی زندگی کے آخری دنوں کے واقعات سنانے لگیں۔ ادھر میرے ذہن نے پل بھر میں ہزاروں میل کی مسافت طے کر لی تھی۔ کراچی سے ہزاروں میل دور، ضلع مظفر نگر کے مشرق میں واقع قصبہ میراں پور کے محلہ دربار کوٹلہ کی ایک شکستہ حویلی میں ستر پچہتر برس کی اعجاز کی مفلوج ماں اپنی زندگی کی آخری سانسیں لے رہی تھیں۔ ان کے دائیں بائیں پلنگ کی پٹیوں پر ان کی سب سے چھوٹی بہو سنجیدہ اور میری بیٹی فہیم بیٹھی تھیں۔ سنجیدہ کامیاں اور اعجاز

کا بھائی ماں کو اس حالت میں چھوڑ کر اعجاز سے ملنے کراچی پہنچا تھا اور اِدھر اس کی ماں دنیا سے سدھارنے کو بالکل تیار۔ ان کی دھندلی آنکھوں میں تینوں بیٹوں کے سراپے گھوم رہے تھے۔

"مرتے مرتے بھی انہوں نے تمہیں یاد کیا۔ بار بار کہا کرتے تھے۔ اسے خط لکھ دو۔ مجھے یقین ہے وہ ضرور آئے گا۔ پچھلے، جب وہ آیا تھا تب یار دوستوں میں زیادہ رہا۔ اب کے آئے گا تو تم ایک کام کرنا۔ اُس کا پاسپورٹ چھپا کر رکھ دینا۔ میں اسے کہیں جانے نہیں دوں گا۔ بھلا کوئی بات بھی ہے۔ ہم نے تو اڑتیس برسوں میں پورے کراچی میں چار دوست نہیں بنائے اور اس نے بمبئی میں بیٹھے بیٹھے کئی دوست بنا لیے۔ کراچی، لاہور، پنڈی، کہاں نہیں ہیں اس کے دوست، بس تم یوں کرنا۔ اس کا پاسپورٹ میرے گدّے کے نیچے چھپا دینا۔ پھر دیکھوں گا کیسے جائے گا..... عذرا انہیں بہکاتی رہی۔ سمجھاتی رہی کہ پھوپھا جان کے لیے کراچی آنا سہل نہیں ہے۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کا ساتھ ہے۔ کئی پرابلم ہیں۔ لیکن وہ تو بھڑک اٹھتے تھے۔ کہتے تھے، مجھے سب پتہ ہے بے بی۔ پھر بھی اسے لکھ دے۔ وہ آجائے گا۔

شربت کا گلاس میرے ہاتھوں میں ضرور تھا۔ لیکن ابھی تک میں نے ایک بھی گھونٹ شربت نہیں پیا تھا۔ افشین نے گلاس کی تہہ پر ہتھیلی رکھ میرا ہاتھ اٹھایا تو پل بھر کی خاطر بھابھی رک گئیں۔ میں نے افشین کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ اور بھابھی نے اس کے گورے گورے رخسار پر چٹکی لیتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

"کیسے لکھ دیتی بے بی۔ جانتی جو تھی۔ تم نہیں آسکو گے۔ تمہارے اپنے پھڈّے تھے۔ تم ان میں گرفتار تھے۔ ہمیں لکھا ہی تھا تم نے، اِدھر ہمارے پھڈّے بھائی جان کے آخری دِنوں میں سلجھے۔ سلجھا لیے گئے۔ دونوں بھائیوں میں خوب معافی تلافی ہوئی۔ اپنے آنسوؤں سے دونوں نے دلوں پر جمے غبار دھوئے پر افسوس پھر بھائی جان نہ جئے۔ انہیں تمہاری ناراضگی کا احساس تھا لیکن کیا کریں بھیّا؟

شام کی چائے پر بھیّا اعجاز اور بھائی مشرف موضوع گفتگو بنے رہے۔ لیکن تب ماحول کی سوگواری ختم ہو چکی تھی۔ ہماری گفتگو میں شاہینہ بھابھی اور الیاس بھائی بھی شریک تھے۔ درمیان میں بھابھی بچوں کے بارے میں پوچھتی رہیں

"اس بیچ بہت سے بچھڑ گئے۔ وہاں اماں جی۔ یہاں ان کے دونوں بیٹے۔ میرا ماموں زاد بھائی امیر، پھر خود ممانی

"وہ ملیر والے

"ہاں۔ مجھے ناصر کو بھی پرسہ دینا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا۔ اس کا سامنا کیسے کروں گا

"اس کی شاید نوبت بھی نہ آئے

"کیا مطلب

"ملیر کے علاقے میں سرِشام کرفیو لگ جاتا ہے۔ آپ تو وہاں انڈیا میں پڑھتے ہی ہونگے کہ یہاں کیا کچھ ہو رہا ہے۔

"ہاں۔ بارہ مصالحوں کی چاٹ ہمیں وہاں ملتی رہتی ہے۔ اور یقیناً آپ سب بھی اسے ہضم کرتے ہوں گے۔

الیاس بھائی غور سے مجھے دیکھتے ہیں۔ پھر ایک مجروح سا تبسم ان کے ہونٹوں پر براجمان ہو جاتا ہے۔ وہ گردن کو اک ذرا سا ترچھا کرنے کے بعد اپنی بیوی کو دیکھتے ہیں۔ اور خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگتے ہیں۔ میں بھی ان کو دیکھتے ہوئے سوچتا ہوں کہ یہ وہ الیاس بھائی تو نہیں ہیں جن کے چہرے پر ۸۳ء میں فخریہ مسکان نظر آتی تھی۔ ہر مسئلہ پر اپنے ملک، اپنی معاشرت اور اپنی تہذیب کی برتری ثابت کرنے کا جنون تھا انہیں۔ پر آج وہ کچھ تھکے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ اور کچھ کچھ خائف بھی۔ میری نگاہوں میں بمبئی کے اخبارات کی سرخیاں گردش کرنے لگتی ہیں۔

"کراچی میں تشدد کی نئی لہر، اسی افراد ہلاک"

"دن دہاڑے نارتھ ناظم آباد پر مسلح نقاب پوشوں کا حملہ"

"فوج کا گشت جاری۔ مگر شہری ہراساں"

اور پھر اسی اخبار کا ایڈی ٹوریل، جس میں اخبار کے فاضل مدیر نے پھر ایک بار پاکستان کے قیام پر ایک مخصوص بیان داغا تھا کہ سن سینتالیس کی تقسیم ہی غلط تھی۔ وہاں دو قومی نظرئے کی موت واقع ہو چکی ہے۔ کیسے صحافی ہیں یہ؟ حقائق کو تسلیم کرنے کا ان میں یارا ہی نہیں۔ بھئی سینتالیس میں دنیا کے نقشے پر ایک ملک اپنے پورے پورے تشخص کے ساتھ ابھرا، آپ نے اُسے تسلیم کرنے کے بعد سفارتی تعلقات بھی قائم کر لئے مگر آج تک اس ملک کے قیام کے اسباب و عوامل کا تجزیہ نہ کرتے ہوئے اپنے دوٹوک انداز میں ملک کی تقسیم کو غلط قرار دے رہے ہیں۔ کیا وہ نہیں جانتے کہ سینتالیس سے پہلے متحدہ ہندستان بھی برطانوی دورِ حکومت میں دو حصوں میں تقسیم تھا۔ پہلے حصّے میں وہ صوبے شامل تھے جہاں براہِ راست برطانوی حکومت کا تسلط تھا، دوسرا حصّہ ان پانچ سو سے زیادہ ریاستوں پر مشتمل تھا جن کی حکومت راجوں مہاراجوں کے ہاتھوں میں تھی۔ اور یہ حکومتیں بھی دراصل برطانیہ کی پٹھو تھیں۔ یہ اور بات ہے کہ دونوں

طرف آج بھی ان رجواڑوں کے درشا وزارتوں کے عہدوں پر مامور ہیں۔ وہ کل بھی اپنے عوام کا استحصال کر رہے تھے اور آج بھی کر رہے ہیں۔ اِدھر مارشل لا اور نظام مصطفوی کے نام پر، ادھر ڈیموکریسی کے گن گاتے ہوئے۔

رات کے کھانے پر دسترخوان کے گرد بھائی مشرف کے تمام بچے، عذرا اور بھابھی موجود تھے۔ بڑی بھابھی اپنے مخصوص نجیب الطرفین والے طمطراق سے گفتگو کر رہی تھیں۔ کھانے کے دوران مرنے والے دونوں بھائیوں کا ذکر چھڑا تو کچھ پرانے زخموں سے مواد رسنے لگا۔ چھوٹی بھابھی نے برا سا منہ بناتے ہوئے ہاتھ روک کر میری طرف دیکھا۔ میں نے کنکھیوں سے بھائی مشرف کے بڑے بیٹے محسن کو۔ اور اُس نے گھور کر اپنی ماں کو۔ ماں نے بیٹے کی نظروں کا مفہوم سمجھ کر بات کا رخ موڑنے کی خاطر دہی کی پلیٹ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا

"یہ لو۔ چاولوں پہ ڈال کر کھاؤ"

میں نے مسکراتے ہوئے پلیٹ ان کے ہاتھ سے لینے کے بعد دسترخوان پر رکھ دی۔ ان کی ساتویں آسمان سے گفتگو کرنے کی عادت سے میں نہ صرف واقف تھا بلکہ اس کے باعث ۸۳ء میں قدرے بدمزگی بھی پیدا ہو گئی تھی۔ جس کے نتیجے میں۔ ان سب سے بغیر ملے ہی بمبئی لوٹ گیا۔ اور اب جبکہ وقت بدل چکا ہے۔ ان پر بچوں کے فیصلے اثر انداز ہونے لگے ہیں تب بھی بڑی بھابھی نے اپنی خو نہیں بدلی ہے۔

کون سی نئی بات ہے یہ۔ مرنے والے دونوں سگے بھائی اس ملک میں اتفاق سے نہ جی سکے۔ مار پیٹ کی نوبت تو ان میں نہیں آئی اور اس کا امکان اس لیے بھی نہیں تھا کہ دھینگا مستی کے ماحول میں پرورش نہیں پائی تھی۔ شریف لوگ تھے۔ زندگی گذارنے کا سلیقہ جانتے تھے۔ اور بڑے سلیقے سے دونوں ہی بھائی ایک دوسرے کے داؤ پیچوں سے خود کو بچاتے رہے تھے۔ بڑا چونکہ ہر طرح سے مضبوط تھا۔ لہٰذا چھوٹا متاثر ہوتا رہا۔ چھوٹے کی تمام تر یافت کو مختلف حیلوں بہانوں سے بڑا ہتیا لیا کرتا۔ چھوٹے نے جب بھی احتجاج کی خاطر منہ کھولا تو کبھی گھڑکا، کبھی ڈانٹا۔ نتیجہ — ساتھ رہنے والے دو بھائی، بالآخر الگ ہو گئے۔ ایک نے جمشید روڈ پر ڈیرہ ڈالا، دوسرا یوسف پلازہ پر جما رہا۔ دربار کوٹلہ سے دہکتے ہوئے انگاروں کی ایک انگیٹھی لے کر دونوں بھائی یہاں آئے تھے۔ یہاں پہنچ کر انہوں نے انگیٹھی توڑ دی، اور دہکتے ہوئے انگارے تقسیم کر لیے۔

تقسیم، جمع، ضرب اور تفریق

"کتنی عجیب بات ہے ۱۹۴۶ء تک متحدہ ہندستان کے لیے جان دینے والے صف اوّل کے

رہ نما سنہ ۴۶ء کے درمیان تقسیم کے حامی ہو گئے تھے۔" اور اس کے بعد دونوں ملکوں میں سوچے سمجھے منصوبے کے تحت جنگ آزادی کی جو تاریخ لکھی گئی ہے وہ آنے والی نسلوں کو گمراہ کرنے کے لیے کافی ہے۔ ہم نے بانیٔ پاکستان کا تعارف اپنے عوام سے بحیثیت ولن کروایا ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ دادا بھائی نوروجی اور گوپال کرشن گوکھلے کی حریت پسندی سے سرشار محمد علی جناح نے انڈین نیشنل کانگریس کے حریت پسند بازو کی معیت میں اپنے سفر کا آغاز کیا تھا۔ غرض یہ کہ متحد ہندستان کی خاطر وہ، پنڈت جواہر لال نہرو اور پٹیل سیاست کی میز پر کئی مرتبہ یکجا ہوئے۔ "نہرو رپورٹ" "چودہ نکات" "گول میز کانفرنس" بازی جمتی رہی، مہرے بڑھتے رہے، پٹتے رہے کبھی مالیات کا قلمدان دے کر تقسیم کو روکنے کی کوششیں ہوئیں لیکن دھنا سیٹھوں کا مہرہ اپنی بے جا ضد پر اڑا رہا۔ اور نتیجہ کیا ہوا؟ جب تقسیم کا مطالبہ شدت اختیار کرنے لگا تھا تو اس نے جھنجھلا کر باپو سے کہا تھا "پاکستان کا ٹکڑا ان کے آگے پھینک دو۔ کل یہ خود ہاتھ جوڑتے ہوئے آئیں گے اور کہیں گے ہمیں ساتھ لے لو۔ ہم سے گاڑی نہیں چلتی"

محسن اپنے کسی دوست کی سوزوکی لے آیا تھا۔ عذرا، بالی بھابھی اور میں سوزوکی میں بیٹھ گئے، ڈرائیونگ سیٹ کے برابر کھڑے ہو کر محسن اپنے دوست کے ساتھ کسی سنجیدہ مسئلہ پر گفتگو کر رہا تھا، کافی دیر بعد بھی جب ان کی گفتگو ختم نہ ہوئی تب میں گاڑی سے نیچے اترا،

"کیا بات ہے

"یہ بتا رہا ہے کہ پیر الٰہی کالونی کے پاس نقاب پوش سواروں نے فائرنگ کی ہے۔

محسن نے جواب دیا تو یکبارگی میرا دل بوجھل ہو گیا، گردن کو گھما کر میں نے عذرا اور بھابھی کی طرف دیکھا۔ وہ آپس میں بات چیت کر رہی تھیں۔

"کوئی اور راستہ جمشید روڈ پہنچنے کا؟

"ہے۔ جہانگیر روڈ والا، پر یہ بتا رہا ہے کہ وہاں بھی ہنگامہ ہوا ہے۔ مہاجروں نے حملہ آوروں کو پہچان لیا تھا اور اس کے بعد ہی لڑکوں نے دیگوں پر حملے شروع کر دیئے۔

"ہوں

"آپ تینوں یہیں رک جائیں۔ ہم ایڈجسٹ کر لیں گے

میں نے محسن کی تجویز کو سن کر یوسف پلازہ کی عمارت کو دیکھا۔ دوسری منزل کی کھڑکی سے بڑی بھابھی

اور بچے سر نکالے ہمیں دیکھ رہے تھے۔

"اب کیا ایڈجسٹ کرو گے

غیر ارادی طور پر میری زبان سے یہ جملہ نکل گیا۔ محسن اور اس کے دوست نے حیرت سے میری طرف دیکھا، پھر ایک دوسرے کو

"ایسا کرو، ہمیں بفرزون پہنچا دو۔ سخی حسن کی طرف سے

"یہ ممکن ہے

اُس کے دوست نے جواب دیا اور دروازہ کھول کر اسٹیرنگ سیٹ پر بیٹھ گیا، محسن گھوم کر اُس کے برابر والی سیٹ پر جا بیٹھا

بفرزون پہنچے تو میرے بڑے بھائی اور بچے خوش گوار حیرت سے دوچار ہو گئے۔ میری آمد ان کے لیے غیر متوقع تھی۔ انہیں میرا خط بھی نہیں ملا تھا۔ میں نے بلا تاخیر محسن کے دوست کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اسے اور محسن کو رخصت کیا، پھر ہم ہال میں آکر بیٹھ گئے۔ بھائی صاحب میرے بچوں کی خیریت دریافت کرتے رہے، بھتیجیاں اپنے بھائی بہنوں کی بابت معلوم کرنے لگیں، بھائی صاحب کی بہو نے پوتے کو میری گود میں بٹھا دیا۔ اجنبی گود میں بچّہ مچلنے لگا تب بھائی صاحب نے آگے بڑھ کر اسے لے لیا۔ کب آئے۔ کیسے آئے، وہاں سب کیسے ہیں۔ کئی سوالات تھے اور میں تنہا ان کے جوابات دے رہا تھا۔

"بھئی ہم تو عاجز آ گئے۔ یہاں کے حالات ایسے خطرناک موڑ پر پہنچ جائیں گے۔ اس کے بارے میں تو کبھی سوچا ہی نہ تھا

"چچا — اس دن بڑی شدت سے آپ یاد آئے جب پہلی مرتبہ زبان کے مسئلہ پر بلوہ ہوا۔ میں نے بھائی جان سے کہا تھا کہ چچا انڈیا سے آئے تھے اور ملتان سے لوٹے تھے تب انہوں نے کہا تھا کہ عنقریب یہاں لسانی بنیادوں پر ہنگامے ہوں گے۔ کیونکہ ملتان میں ادیبوں اور شاعروں نے یہ سوال اٹھایا تھا کہ اردو کس بنیاد پر پاکستان کی قومی زبان قرار دی گئی۔

"ہاں۔ ہوئی تھیں اس طرح کی باتیں وہاں

"بھئی اگر قائدِ اعظم کچھ اور جیتے تو یہ ہنگامے نہ ہوتے

بھائی صاحب نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا تو میں مسکرانے لگا۔ ان کی سب سے چھوٹی لڑکی حنا نے غور سے مجھے دیکھا۔ میرے حوالے سے بات اسی نے شروع کی تھی، پھر اپنے جھٹکے دار لہجے میں

وہ بھائی صاحب سے مخاطب ہوئی

"کہیں کچھ گڑبڑ ضرور ہوئی ہے ابّاجی۔ میں یہ کہنے کی جسارت نہیں کروں گی کہ قائداعظم نے اردو کو سرکاری زبان بنا کر غلطی کی۔ مگر یہ ضرور کہوں گی کہ جو کچھ ان کے ذہن میں رہا ہوگا اُس سے ہم آگاہ نہ ہو سکے۔

"سیاست دانوں کا خیال ہے کہ اس میں بیرونی ہاتھ کی کارفرمائیاں زیادہ ہیں اور حزب اختلاف کھل کر انڈیا کی طرف اشارہ کرتا ہے دوسری بھتیجی بھی بات چیت میں شامل ہوگئی۔

"بھئی ہماری بُوبُو یعنی ڈاکٹر فرحت کہاں ہیں؟

میں نے بڑی بھتیجی کے بارے میں معلوم کیا۔ مقصد یہ بھی تھا کہ موضوع تبدیل ہو، کچن سے فرحت کی آواز آئی۔

"میں یہاں ہوں چچا۔ چائے بنا رہی ہوں، کڑک اور میٹھی۔ بس ابھی حاضر ہوتی ہوں

"اس مسئلہ پر آپ کا کیا خیال ہے؟

بھائی صاحب کا بڑا بیٹا اب میدان میں اترا۔ میں جانتا ہوں وہ پیپلز پارٹی کا سرگرم ممبر تھا پارٹی کی جانب سے مارشل لا کی خلاف ورزی کے باعث ملازمت سے معطل بھی کیا گیا تھا۔ وہ سیاسی موضوعات پر جذباتی انداز میں گفتگو کا عادی ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے ۸۳ء میں ہم جب پہلی بار ملے تھے تب اُس نے بڑے تلخ انداز میں کہا تھا۔

"آپ چچا ہیں۔ یہ ایک سچائی ہے۔ اور دوسری سچائی یہ ہے کہ آپ اس ملک سے آئے ہیں جس کی ریشہ دوانیوں کے باعث ہمارا مشرقی حصہ ہم سے الگ ہوگیا۔

یہی وہ جارحانہ سوچ تھی جو مختلف راستوں سے ہوتے ہوئے اب علاقائی لسانی بنیادوں پر ان سب کو آپس میں لڑوا رہی ہے۔ تکّے بوٹی اور مرغ و ماہی کھانے کے بعد جب چربی میں کولیسٹرول بڑھتا ہے تو چربی کے وہ اجزا جو جسمانی خلیوں کو ضروری توانائی فراہم کرتے ہیں ٹھیک کام نہیں کرتے، نتیجہ ظاہر ہے۔ سب سے پہلے ذہن ہی اختلال کا شکار ہوتا ہے پھر .....

"کیا سوچنے لگے آپ چچا۔ میں آپ کا خیال .....

"میرے خیال کی کیا اہمیت ہے میاں؟

"پھر بھی

"بیرونی ہاتھ کی تھیوری سو فیصد درست ہو سکتی ہے۔ لیکن ہم اور تم دونوں ہی اس اہم نکتے پر دھیان نہیں دیتے کہ داخل کے انتشار کے بغیر خارجی عوامل پیش قدمی نہیں کرتے۔ صاف اور سیدھے

طریقے سے کہوں کہ ہم خود ہی بیرونی ہاتھ کو اشارے سے بلاتے ہیں۔ یعنی وہ بیرونی ہو کر بھی ہمارا اپنا ہاتھ ہوتا ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اُس کے مختلف اسباب ہو سکتے ہیں۔ لیکن جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ ہم اپنے آپ سے بھی مخلص نہیں رہے اور سارا بگاڑ یہیں سے شروع ہوا۔

" ہم تو مخلص تھے۔ کل بھی، اور آج بھی۔ یہ جو کچھ بھی ہو رہا ہے وہ تو مسلسل استحصال کا ردِ عمل ہے۔

" ممکن ہے تمہاری بات درست ہو۔ لیکن یہ نہ بھولو کہ تمہارے ہاں ۴۷ء کے بعد وہ لوگ اقتدار اور ملک کی معیشت پر قابض ہو گئے جنھوں نے پاکستان کی تشکیل میں عملی طور پر کسی صورت بھی حصہ نہیں لیا۔ یعنی وہ ۱۴ اگست ۴۷ء کی رات کو سوئے تو متحدہ ہندستان میں اور اٹھے پاکستان میں۔ اس طرح ایک گڑبڑ تو یہ ہوئی کہ جنھوں نے پاکستان کی تعمیر میں اپنا سب کچھ لگایا وہ یہاں پہنچ کر خاطر خواہ کامیابی نہ حاصل کر سکے۔ اگر ایمان داری سے تفتیش کی جائے تو کسٹوڈین کی فائلوں میں تمہیں آج بھی ایسے کئی نام نہاد مہاجر مل جائیں گے جو سرے سے مہاجر ہی نہ تھے

" یقیناً ایسا ہوا ہے۔ بھائی صاحب نے میری بات کی تائید کی

" مگر سوال یہ ہے کہ مہاجروں کے ساتھ ناانصافی کیوں جبکہ پاکستان کا نقشہ، اس کا خیال۔ اس کی تشکیل سب ہی کچھ تو مہاجروں کا رہینِ منت ہے ــــ حنا بھی جذباتی ہو چلی تھی۔ میں نے غور سے حنا کو دیکھا۔ اور سوچنے لگا۔ مسلسل استحصال کے باعث انہوں نے دیگر پہلوؤں پر غور کرنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی۔ یہی سبب ہے کہ آج ان کی تحریک سندھ تک محدود ہے۔ ورنہ ۴۷ء میں پاکستان بھاگنے والے مسلمانوں نے تو وہاں پہنچنے کے بعد اپنے آپ کو بیجوں کی طرح پورے ملک میں بکھیر دیا تھا۔ لیکن سندھ میں بسنے والے مسلمانوں نے اپنے تشخص پر مسلسل اصرار کیا۔ زبانی طور سے بھی اور عملی سطح پر بھی۔ انہوں نے وہاں پہنچ کر غول در غول رہنا شروع کیا، پلاٹ ریزرو کروائے، کالونیاں قائم کیں تو ان کے نام غیر پاکستانی رکھے۔ اسی طرح کی چھوٹی چھوٹی باتیں دِلوں میں دوریاں پیدا کرتی رہیں۔ لہٰذا برسوں بعد جب مسلسل استحصال کے خلاف آواز اٹھائی گئی تب بھی وہی غلطی دُہرائی گئی۔ بجائے اس کے کہ اس تحریک کو قومی قرار دیا جاتا اُسے مہاجر قومی موومنٹ کا نام دیا گیا سندھ میں بسنے والے مہاجروں نے کبھی اس پر غور ہی نہیں کیا کہ مہاجروں کا مسئلہ صرف اس خطّے تک کیوں محدود ہے؟

" یہ کوئی نئی بات نہیں ہے بیٹے۔ درخت کوئی۔ لگاتا ہے اور اس کا پھل کوئی اور پالیتا ہے۔

" لیکن یہ غلط ہے۔ اور اب ردِ عمل ظاہر ہو رہا ہے ــــ لوگوں کی سمجھ میں آنے لگا ہے کہ مہاجر

چھوٹی مچھلی نہیں

بڑے بھتیجے کی جذباتیت پر میں مسکرانے لگا۔ اُس نے غور سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا

"آپ کی مسکراہٹ بڑی معنی خیز ہے

"ہاں۔ کیوں کہ میں دیکھ رہا ہوں کہ ڈیپریشن خطرناک حد تک سرایت کر چکا ہے۔

"آپ کا اپنے بارے میں کیا خیال ہے؟ ــــ اُس نے چبھتے ہوئے انداز میں مجھ سے سوال کیا۔

میں نے پھر مسکراتے ہوئے جواب دیا

"صورت حال دونوں جگہ ایک سی ہے۔ بس چہرے بدلے ہوئے ہیں۔ اور تھوڑی سی سچویشنز۔ پیٹرو ڈالر نے تمہیں کلاشنکوف معاشرے کی نذر کر دیا ہے اور

"اور آپ کے ہاں اس کی وجہ سے فسادات ہو رہے ہیں۔

"تمہاری بات پوری طرح درست نہیں ہے بیٹے۔ ہمارے یہاں فسادات کے مختلف اسباب ہیں۔ جن میں ایک بڑا اور اہم سبب تم ہو

"ہم

"ہاں تم ــ مگر اب ہم عادی ہو چکے ہیں۔ طعنے اور گالیاں سنتے سنتے ہمارے کان پک گئے ہیں۔ اس کے باوجود ہم وہاں موجود ہیں اور انشاء اللہ وہیں رہیں گے۔

"یہ کیا باتیں لے بیٹھے تم سب ــــ برسوں بعد آیا ہے۔ کچھ اپنے گھر کی کہو۔ کچھ دلہن اور بچّوں کی سنو۔ رفعت اور پروین کو اطلاع دے دو، بمبئی سے چچا آئے ہیں۔

چالیس پینتالیس منٹوں کے اندر ہی دونوں بھتیجیاں آگے پیچھے اپنے اپنے شوہر کے ساتھ پہنچ گئیں، رسمیات سے فارغ ہو کر گھریلو نوعیت کی گفتگو چھڑ گئی، دونوں داماد خاموشی سے ہمیں بات چیت کرتے دیکھتے رہے۔ رفعت کے میاں نے پہلو بدلتے ہوئے ہماری گفتگو میں حصہ لیا۔

"چچا ــ انڈیا میں بھی حالات خطرناک حد تک خراب ہو چکے ہیں۔ آپ اپنی لڑکیوں کا بیاہ اسی طرف کریں۔ ویسے بھی آپ کا پورا خاندان یہیں موجود ہے۔

میں نے غور سے رفعت کے میاں کو دیکھا۔ پھر کنکھیوں سے بھائی صاحب کو، ان کا چہرہ ہر طرح کے جذبات سے عاری تھا، میں نے دیکھا، بھابھی بھی انہی کی طرف دیکھ رہی تھیں، نظروں کے پرکار گھماتے ہوئے میں نے یہ بھی دیکھا کہ پروین، رفعت، عذرا اور اُس کی امّی میرے چہرے کو پڑھنے

میں مصروف ہیں۔

" ہاں ۔ تین بھائی ہیں تو ــــ دو ملتان میں اور ایک یہاں ۔ لیکن ۔ برا نہ مانو تو ایک بات کہوں

" فرمایئے

" میں خواب نہیں دیکھا کرتا ۔ جاگتے میں تو بالکل نہیں ۔

" ہم سمجھے نہیں ــــ رفعت آگے کی طرف جھکتے ہوئے ہمہ تن گوش ہوگئی

" ایسا ہے بیٹے ۔ خوابوں کے ٹوٹ کر بکھرنے کی اذیت ناقابلِ برداشت ہوا کرتی ہے

" وہ تو ٹھیک ہے چچا ۔ لیکن میری تجویز کا خوابوں سے کیا تعلق ؟

" ہے ۔ بڑا گہرا تعلق ہے ۔

بھائی صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں داماد کو جواب دیا ۔ سب ان کی طرف متوجہ ہوگئے ، انہوں نے سب پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی پھر سگریٹ جلانے کے بعد نتھنوں سے دھواں چھوڑتے ہوئے بولے

" ہم منافقوں کے درمیان جیتے رہے ہیں اور یہ ..... منافقت پسند نہیں کرتا

" آپ تو پہیلیاں بجھوانے لگے ابّا جی ــــ بھائی صاحب کی لاڈلی حنا نے ٹھنک کر ان سے کہا

" تو پھر اسی سے سنو

کئی آنکھوں کے زاویئے ایکدم سے بدلے میں نے ایک ایک چہرہ دیکھا ۔ ہر چہرے پر اشتیاق ڈیرا ڈالے ہوئے نظر آیا ۔ ایک مرتبہ خیال آیا کہ بات گول کر جاؤں پھر فوراً ہی دوسرے خیال نے پہلے والے کو درمیان سے کاٹا کہ نہیں ، موقع اچھا ہے ۔ اپنے دل کی بات کہہ دو ۔

" میں نے ابھی کہا تھا کہ تین بھائی ہیں ۔ یہ بچیاں جانتی ہیں ۔ میں نے تقریباً چھتیس برسوں بعد ٹوٹے ہوئے تعلقات دوبارہ قائم کئے تھے ۔ پہلے جب میں یہاں آیا تھا تب جو کچھ میں نے دیکھا ، سنا ۔ اس سے میرے اندر بہت کچھ ٹوٹ پھوٹ گیا تھا ۔ صورتِ حال آج بھی تقریباً وہی ہے ۔ کیوں کہ تینوں ہی بھائیوں نے مشترکہ خاندان کی افادیت کو جانتے بوجھتے بھی اسے اہمیت نہیں دی ۔ نتیجتاً گھر کی بچیاں باہر بیاہ دی گئیں ۔ اور باہر ہی سے ان گھروں میں دلہنیں بھی آئیں ۔ میں ..... نے اپنی بچیوں کے بارے میں اکثر سوچا کہ انہیں اسی طرف بیاہوں لیکن تنہا میرے سوچنے سے کیا ہوتا ہے ۔ پھر جس تیزی سے حالات بدل رہے ہیں وہ بھی مجھے اس طرف دیکھنے سے روکتے ہیں ۔

" حالات کا کیا ہے چچا ۔ وہ تو بدلتے ہی رہتے ہیں ۔ سیاسی حالات کی تبدیلی عام انسانی زندگی

پر پوری طرح اثر انداز نہیں ہوتی

" میں تمہاری بات سے متفق نہیں ہوں۔ کہیں نہ کہیں عوامی سطح پر اس کا اثر پڑتا ہی ہے

" کیا ضروری ہے کہ وہ کہیں ہمارا ہی خاندان ہو

رفعت کے میاں نے بڑے ٹھوس لہجے میں جواب دیا تو میں نے خاموش ہو کر بھائی صاحب کو دیکھا۔

" آپ مائگریٹ کریں۔ یہاں جمنے کے بعد بچیوں کی شادی بھی آپس میں کریں، اب تو ویسے بھی اللہ کے فضل سے خاندان وسیع ہو چکا ہے۔

" میرے لئے ممکن نہیں ہے

" کیوں پھوپھا جان۔ عذرا نے پہلی مرتبہ گفتگو میں شرکت کی

" بھائی صاحب کی رائے ٹھیک ہے۔ بس آپ آجائیں۔ تائے ابا اور آپ کے درمیان جو محبت ہے اس کو دیکھتے ہوئے مجھے یقین ہے آپ کو ایڈجسٹ ہونے میں دیر نہیں لگے گی۔

" عجّو۔ تم اور یہ بچے۔ خالص جذباتی انداز میں سوچ رہے ہو۔ نقلِ مکانی کے بارے میں تو میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ کیوں کہ تم نے ایکدوسرے کا خون بہاتے وقت اپنی آنکھیں بند کر رکھی ہیں۔

" ہماری آنکھیں تو اب کھل گئیں ہیں چچا۔ ہم ایک طاقت بن کر ابھرے ہیں۔ اور .....

" ہاں۔ یہ سچ ہے۔ تم ایک طاقت بن کر ابھرے۔ مگر کس کے خلاف ؟ اپنوں ہی کے نا! اور یہ کتنی بڑی حماقت ہے کہ تمہیں اپنوں پر ہی شبہ ہے جبکہ تمہارا اصل دشمن کہیں اور ہے۔

" ہمیں پتہ ہے، ہمارا اصل دشمن ..... انڈیا ہے!

بڑے بھتیجے نے صاف گوئی سے کام لے کر اپنے دِل کی بات کہہ دی۔ میں نے ناگواری سے منھ بناتے ہوئے اُس کی طرف دیکھا۔ چند ثانیہ خاموشی رہی پھر میں نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا

" وہم ہے تمہارا۔

" یہ فیکٹ ہے

" کہا نا۔ وہم ہے تمہارا۔ یہ سچ ہے کہ میں تمہارا چچا ہوں اور یہ بھی سچ ہے کہ میں پکا ہندستانی ہوں۔ یہ بھی سچ ہے کہ ہمارے یہاں کے کچھ خبط الحواس پاکستان کے وجود سے نفرت کرتے ہیں۔ لیکن سب سے بڑا سچ یہ ہے کہ تمہارا وجود ہماری بقا کے لیے بڑا اہم ہے اور یہی وہ نکتہ ہے جس پر اِدھر اور اُدھر کے مٹھی بھر احمق غور نہیں کرتے۔

میں نے عمداً رک کر سب پر نگاہ ڈالی۔ سب ہی میری طرف متوجہ تھے۔ پہلو بدلتے ہوئے میں نے کہا

"شاید تمہیں نہیں معلوم پچھلے دنوں ہمارے یہاں سوویت روس کی سائنس اکادمی کے سینئر نائب صدر پروفیسر اے۔ ایل یاں، شبان نے راجستھان کے اراولی پربت کا معائنہ کرنے کے بعد کہا تھا کہ " زمین پانی پر پلیٹ کی طرح تیرتی ہے۔ جس سے ہندستان کا یہ علاقہ ہر سال دو سینٹی میٹر روس کی طرف کھسکتا جا رہا ہے" اس انکشاف پر کسی احمق نے ان سے پوچھا کہ کتنے برسوں بعد ہندستان اور روس ایک ہو جائیں گے؟ جانتے ہو انہوں نے کیا جواب دیا؟

میں نے اپنی بات روک کر یکے بعد دیگرے سب کے چہرے دیکھے۔ سب حیرت زدہ تھے۔ انہیں تحیر کے عالم میں چھوڑ کر میں نے کہا۔

" ان کا جواب تھا" ہندستان اور روس کے درمیان پاکستان دیوار بنا ہوا ہے۔ اگر دونوں ملک اس دیوار کو گرادیں تو ہم ایک ہو سکتے ہیں"[۴۳]

میرے خاموش ہوتے ہی ہال پر مکمل سکوت چھا گیا۔ میں نے پھر ایک ایک چہرہ دیکھا۔ وہ سب ہی چپ تھے۔ ان کی آنکھوں میں کئی سوال مچل رہے تھے۔ کافی دیر بعد بھائی صاحب کی اور میری نظریں ملیں تو میں نے انہیں مخاطب کیا۔

" آپ نے تو ۴۲ء سے ۴۸ء تک کا زمانہ خوب دیکھا ہے۔ پاکستان کی تشکیل میں تھوڑا بہت آپ کا بھی حصہ رہا ہے۔ میں نے تو اس پورے تاریخی عمل کو بزرگوں اور کتابوں کی مدد سے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ اور میں سوچتا ہوں کہ آج سارا کھڑاک اس لیے ہے کہ انگریزوں نے ہمیں ۴۷ء میں آزاد کر دیا۔

" کیا مطلب

" مطلب یہ کہ ہم نے اپنا ٹارگٹ کچھ پہلے ہی حاصل کر لیا

" میں سمجھا نہیں۔ تم کیا کہنا چاہتے ہو

" صرف ایک سوال کرنا چاہتا ہوں۔ آپ سے۔ اپنے آپ سے۔

" کون سا سوال؟

" اگر ہم ۱۹۵۷ء میں آزاد ہوتے تب بھی کیا یہی سب کچھ ہوتا؟

---

۴۳ "اردو بلٹز" ص ۹ شمارہ ۸ مطبوعہ ۲۴ فروری ۱۹۹۰ء (رپورٹ راحت ابرار) مرسلہ علی گڑھ

۴۱ JINAH GREATOR OF PAKISTAN، بولیتھو۔ ص ۵۷ – ۵۸، مطبوعہ ۱۹۵۴ء

کیا آپ اپنی کتاب چھپوانا چاہتے ہیں؟

اگر آپ کو کسی اُردو اکیڈمی یا کسی دیگر ادارے سے کتاب کی اشاعت کے لئے جزوی مالی امداد ملی ہے تو ایسی کتاب کی اشاعت کے لئے ہماری خدمات حاصل کریں۔

کتاب کسی معیاری موضوع پر ہونا ضروری ہے۔ ناول، افسانے، تنقید و تحقیق وغیرہ پر کتابوں کی اشاعت کے لئے ہماری خدمات حاصل کریں۔

تفصیلی معلومات اور شرائط کے لئے ڈاک ٹکٹ لگے جوابی لفافے کے ساتھ ذیل کے پتے پر رابطہ قائم کریں۔

تخلیق کار پبلیشرز، ۱۷۷۹، کوچہ دکھنی رائے، دریا گنج، نئی دہلی ۲

معیاری ادب کی دُنیا میں ایک معتبر نام

۱۷۷۹، کوچہ دکھنی رائے، دریا گنج، نئی دہلی، ۱۱۰۰۰۲

"علی امام نقوی ان افسانہ نگاروں میں سے ایک ہیں،
جنھوں نے بندھے ٹکے ضابطوں کے بجائے بیانیہ کی نئی راہیں تلاش کی ہیں —— ان کی کہانیوں کے موضوعات زندگی کے تلخ حقائق سے ماخوذ ہیں۔ وہ پریوں، شہزادیوں اور مافوق الفطرت مخلوق کی کہانیاں نہیں سناتے، بلکہ زندگی کا افسانہ سناتے ہیں۔ اسی لئے ان کی کہانی ان لوگوں کے لئے دل چسپی فراہم کرتی ہے، جو زندگی سے بھاگنے کی بجائے اس سے اُلجھنے کا سلیقہ رکھتے ہیں۔"

مصنف کی کتابیں:

نئے مکان کی دیمک	(افسانے)	مطبوعہ	۱۹۸۰ء
مباہلہ	(افسانے)	"	۱۹۸۸ء
تین بتی کے راما	(ناول)	"	۱۹۹۱ء
گھٹتے بڑھتے سائے	(افسانے)	"	۱۹۹۳ء

اہتمام:
تخلیق کار پبلیشرز
۱۰۴/۱۷، کوچہ دکھنی رائے۔ دریا گنج۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲